﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾

[التوبة:۱۲۲]

”مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب نکل جائیں، پس ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کے بڑے گروہ میں سے ایک چھوٹا گروہ نکل جاتا تاکہ [جو لوگ رہ جائیں] وہ دین کا علم حاصل کریں۔“

مبادیاتِ فقہ

(تاریخِ فقہ، احوالِ ائمہ اور ضروری فقہی فوائد)

مع

ہدایہ، قدوری اور نور الایضاح اور ان کے مصنفین کا تعارف

مؤلف:

محمد یحیی بن عبد الحفیظ قاسمی

ناشر

مکتبہ نعیمہ، ممبئی

کتاب کی مختصر تفصیلات

نام:..................................مبادیاتِ فقہ
(تاریخِ فقہ، احوالِ ائمہ اور ضروری فقہی فوائد)
مع
ہدایہ، قدوری اور نور الایضاح اور ان کے مصنفین کا تعارف
مؤلف:..........................(مفتی) محمد یحیٰ ابن عبد الحفیظ (قاسمی، ممبئی)
سالِ اشاعت:.........................جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۴۷ھ مطابق نومبر ۲۰۲۵ء
ناشر:..مکتبہ نعیمہ؛ ممبئی
تعداد:..ایک ہزار (۱۰۰۰)
صفحات:......................................دو سو پینتالیس (۲۴۵)
قیمت:..چار سو پچاس (۴۰۰)

کتاب ملنے کا پتہ:

(مفتی) محمد یحیٰ ابن عبد الحفیظ (قاسمی، ممبئی)
رابطہ نمبر:
۹۸۱۹۸۸۶۸۳۲

فہرست

کتاب کی مختصر تفصیلات ۲
فہرست ۳
تقریظ ۱۷
پیش لفظ ۱۹
رؤسِ ثمانیہ: ۲۲
مبادی: ۲۲
لفظِ مقدمہ کا مطلب: ۲۲
مقدمہ کی دو قسمیں ہیں: ۲۳
لفظِ فقہ کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ: ۲۳
فقہ کی اصطلاحی تعریف: ۲۵
تعریف میں فوائدِ قیود: ۲۶
(۲)علمِ فقہ کا موضوع: ۲۷
(۳)غرض و غایت: ۲۸
علمِ فقہ کی غرض و غایت: ۲۸
(۴)اسماء: ۲۹
(۵)ما بہ الاستمداد: ۲۹
(۶)حکمِ شارع: یعنی علمِ فقہ کو پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ ۳۰
(۷)فضیلت: ۳۰

(۸)نسبت و مرتبہ: ۳۳
(۹)مسائل: ۳۴
(۱۰)واضع و مدوِّن: ۳۴
مختصر سوانح ائمۂ اربعہ اور فقہِ حنفی کے عمود اربعہ ۳۵
۱)امام مالک رحمۃ اللہ علیہ: ۳۵
۲)امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ: ۳۷
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہبِ قدیم اور مذہبِ جدید: ۳۸
۳)امام احمد رحمۃ اللہ علیہ: ۳۹
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: ۴۰
علماء و محدثین کے اقوال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں: ۵۰
فقہِ حنفی کے چار ستون: ۵۳
۱)امام زفر رحمۃ اللہ علیہ: ۵۳
۲)امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ: ۵۳
۳)امام محمد رحمۃ اللہ علیہ: ۵۴
۴)امام حسن رحمۃ اللہ علیہ: ۵۴
ائمۂ اربعہ اور فقہِ حنفی کے عمودِ اربعہ ایک نظر میں ۵۶
فقہِ حنفی کا سلسلہ بصورتِ شجرہ ۵۷
.... ۵۷
فقہ کے اَدوار و مراحل (مختصراً) ۵۸

پہلا دور: عہدِ نبوی ۵۹
دوسرا مرحلہ: خلافت راشدہ ۵۹
تیسرا مرحلہ: اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین کا ۶۱
چوتھا مرحلہ: اوائل دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی ۶۲
پانچواں مرحلہ: چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے سقوط بغداد تک ۶۵۶ھ ۶۴
چھٹا مرحلہ: سقوط بعداد تا اختتام تیرھوی صدی ۶۴
عہدِ جدید اور فقہِ اسلامی ۶۵
علمِ فقہ کی فضیلت، اہمیت اور ہمہ گیریت ۶۶
فقہ اسلامی کی اہمیت اور ہمہ گیریت: ۶۶
فقہِ اسلامی کی شعبہ جات: ۶۶
عبادت: ۶۶
احوالِ شخصیہ: ۶۶
معاملات: ۶۷
مرافعات: ۶۷
عقوبات: ۶۷
علمِ فقہ کی فضیلت: ۶۹
تاریخ تدوینِ فقہ ۷۲
نبیِ کریم ﷺ کے زمانے میں علمِ فقہ: ۷۲
تخریجِ مسائل میں اختلاف اور اس کے اسباب: ۷۵

ضرورتِ تدوینِ فقہ: ٧٧
تدوینِ فقہ کی طرف حاجت شدید تر اور مدون اوّل: ٧٩
کیفیتِ تدوین: ٨١
تدوینِ فقہ کے دور اوّل میں وہ چند مجتہدین جن کا ظہور ہوا: ٩٣
(١)امام لیث بن سعدؒ(٩٤۔١٧٥ھ): ٩٣
(٢)امام سفیان ثوریؒ(٩٧۔١٦١): ٩٣
(٣)امام ابو ثورؒ ابراہیم بن خالد بن ابی ایمان کلبی بغدادی: ٩٤
(٤)امام حسن بصریؒ(٢١۔١١٠ھ): ٩٤
(٥)نیشاپور میں اسحاق بن راھویہ (١٦١۔٢٣٨ھ) ٩٥
(٦)امام عبدالرحمٰن بن عمروالدمشقی الاوزاعی: ٩٥
(٧)الطبری: ٩٦
(٨)الظاھری: ٩٧
(٩)سفیان بن عیینہ بن میمون الھلالی الکوفی، ابو محمد کنیت ہے۔ ٩٧
مسلمانوں کا مذاہب اربعہ میں منحصر ہونا: ٩٨
تقلیدِ ائمۂ اربعہ کا عموم: ٩٩
مذاہبِ اربعہ کی تقلید کے جواز پر اُمّت کا اجماع ہے: ١٠٣
کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ تقلید کے منکر تھے؟ ١٠٣
تقلید اور تقلیدِ شخصی کا وجوب: ١٠٤
مذاہبِ اربعہ سب برحق ہیں: ١٠٧

مذہب امام ابی حنیفہؒ کو دنیا میں حسنِ قبول:........................ ۱۱۰
فقہِ حنفی کی مقبولیت کی وجہ اس کی یہ چند اہم خصوصیتیں ہیں: ۱۱۱
فقہِ حنفی کی حقیقت:.. ۱۱۳
ائمۂ اربعہ کا طرزِ استدلال اور متعارض اَدلہ میں ترجیح کا طریقۂ کار:.......................۱۱۵
امامِ اَعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر اور ان کے مذہب پر بعض اعتراضات اور ان کے جوابات: ۱۲۰
پہلا طعن:.. ۱۲۰
اعتراضِ ثانی: ۱۲۶
فقہائے کوفہ کو ”صاحب الرائے“ کہنے کا مسئلہ:..۱۳۰
تیسرا اعتراض:...۱۳۲
چوتھا اعتراض: ۱۳۴
چند اہم فوائد: ۱۳۶
فقہاء کے طبقے و مدارج: ۱۳۶
الألفاظ الدالة على الترجيح والتصحيح:.....................................۱۳۸
طبقات المسائل الحنفية:..۱۴۰
چند ضروری اصطلاحات ۱۴۵
نصوص کی چار قسمیں: ۱۴۵
(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ:... ۱۴۵
(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ:..۱۴۶
(۳) ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ: ۱۴۶

(۴)ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ:.. ۱۴۶
(۱)احکام:.. ۱۴۶
(۲)فرض:.. ۱۴۷
(۳)واجب:.. ۱۴۷
(۴)عینی:.. ۱۴۷
(۵)کفائی:.. ۱۴۷
(۶)فرض وواجبِ مطلق:.. ۱۴۷
(۷)فرض وواجبِ مقیّد:.. ۱۴۷
(۸)مندوب:.. ۱۴۸
(۹)سنّتِ مؤکدہ:.. ۱۴۸
(۱۰)سنّتِ غیر مؤکدہ:.. ۱۴۸
(۱۱)سنّت زائدہ:.. ۱۴۸
(۱۲)حرام:.. ۱۴۹
(۱۳)حرام لعینہ:.. ۱۴۹
(۱۴)حرام لغیرہ:.. ۱۴۹
(۱۵)مکروہِ تحریمی:.. ۱۴۹
(۱۶)مکروہِ تنزیہی:.. ۱۵۰
(۱۷)مباح:.. ۱۵۰
(۱۸)سبب:.. ۱۵۱

(۱۹)شرط: ۱۵۱
(۲۰)رکن: ۱۵۱
(۲۱)علّت: ۱۵۲
(۲۲)مانع: ۱۵۲
(۲۳)عزیمت: ۱۵۲
(۲۴)رخصت: ۱۵۲
(۲۵)اولیٰ: ۱۵۳
(۲۶)ادب: ۱۵۳
(۲۷)حدیث: ۱۵۳
(۲۸)اجماع: ۱۵۳
(۲۹)اجماعِ قولی: ۱۵۳
(۳۰)اجماعِ سکوتی: ۱۵۴
(۳۱)خبرِ متواتر: ۱۵۴
(۳۲)خبرِ مشہور: ۱۵۴
(۳۳)خبرِ واحد: ۱۵۴
(۳۴)قیاس: ۱۵۴
(۳۵)اجتہاد: ۱۵۵
(۳۶)استدلال: ۱۵۵
(۳۷)استحسان: ۱۵۵

(۳۸)عرف: ۱۵۵
(۳۹)عرفِ عام: ۱۵۶
(۴۰)عرفِ خاص: ۱۵۶
(۴۱)عرفِ صحیح: ۱۵۶
(۴۲)عرفِ فاسد: ۱۵۶
(۴۳)استصحاب: ۱۵۶
(۴۴)ضرورت: ۱۵۶
(۴۵)حاجت: ۱۵۶
(۴۶)منفعت: ۱۵۶
(۴۷)زینت: ۱۵۷
(۴۸)فضول: ۱۵۷
(۴۹)تحرّی: ۱۵۷
(۵۰)تطوع: ۱۵۷
(۵۱)تقلید: ۱۵۷
(۵۲)تحقیقی جواب: ۱۵۷
(۵۳)الزامی جواب: ۱۵۷
(۵۴)حظر: ۱۵۸
(۵۵)ظن: ۱۵۸
(۵۶)قاعدہ: ۱۵۸

(۵۷)ضابطہ: ۱۵۸
(۵۸)شریعت: ۱۵۸
(۵۹)دین: ۱۵۸
(۶۰)ملّت: ۱۵۹
(۶۱)مجتہدِ مطلق مستقل: ۱۵۹
(۶۲)مجتہدِ مطلق منتسب: ۱۵۹
(۶۳)مجتہدِ مقیّد: ۱۵۹
(۶۴)فقیہ النفس: ۱۵۹
(۶۵)کتاب: ۱۵۹
(۶۶)باب: ۱۵۹
(۶۷)فصل: ۱۵۹
(۶۸)صنف: ۱۶۰
(۶۹)شخصی و جزئی: ۱۶۰
(۷۰)عمومِ بلوٰی: ۱۶۰
(۷۱)امرِ تعبّدی: ۱۶۰
متونِ معتبرہ و غیر معتبرہ: ۱۶۰
متونِ معتبرہ: ۱۶۰
اوزان: ۱۶۲
مقدار کی تعریف: ۱۶۲

(۱)صاع:.. ۱۶۲
استار.. ۱۶۴
ایک تولہ.. ۱۶۴
گرام.. ۱۶۴
کلوگرام.. ۱۶۴
سیر انگریزی.. ۱۶۴
۲)رطل:.. ۱۶۴
۳)مُد:.. ۱۶۵
بعض قدیم اوزان:.. ۱۶۵
۴)درھم:.. ۱۶۶
زکات کا نصاب:.. ۱۶۶
مہر کی کم سے کم مقدار:.. ۱۶۷
مہرِ فاطمی:.. ۱۶۷
۵)اوقیہ:.. ۱۶۷
۶)نَش:.. ۱۶۷
۷)دینار او مثقال:.. ۱۶۷
۸)مَن:.. ۱۶۸
۹)حِمل:.. ۱۶۸
۱۰)وسق:.. ۱۶۸

چند قدیم وجدید مساحتیں: ۱۶۸
میلِ شرعی، میل انگریزی اور کلومیٹر میں فرق: ۱۷۰
ماءکثیر کی مقدار: ۱۷۱
میٹر کے اعتبار سے حوض کی لمبائی چوڑائی: ۱۷۱
ہدایہ، قدوری ۱۷۲
اور ۱۷۲
نور الایضاح ۱۷۲
اور ۱۷۲
ان کے مصنفین کا تعارف ۱۷۲
پیش لفظ ۱۷۴
ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا تعارف ۱۷۶
مکمل نام اور پیدائش: ۱۷۶
تحصیلِ علم اور اساتذہ: ۱۷۷
تلامذہ: ۱۷۸
علّامہ مرغینانیؒ کے بارے میں علماء کی آراء و تحسینات: ۱۷۹
وفات: ۱۸۲
تدفین: ۱۸۲
اخلاص واخلاق: ۱۸۳
مذہب میں ان کا مقام: ۱۸۴

تصانیف: ۱۸۴
شانِ ہدایہ علمائے ذی شان کی زبانی: ۱۸۶
ہدایہ کی نصابی اہمیت: ۱۹۲
کتاب ہدایہ کی خصوصیت: (از ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا تعارف) ۱۹۵
وجہِ تالیف: ۱۹۸
اسلوبِ بیان: ۱۹۹
عاداتِ صاحبِ ہدایہ: ۱۹۹
شروح وحواشی: ۲۰۶
تخاریجِ احادیثِ ہدایہ: ۲۰۸
ہدایہ میں حدیث کا حوالہ اور سند کیوں نہیں؟ ۲۱۲
ایک شبہ اور اس کا ازالہ: ۲۱۷
قیاس کی دلیلِ نقلی پر ترجیح کیوں؟ ۲۱۹
بعض ضروری اصطلاحات کی توضیح: ۲۲۰
امام قدوری اور ان کی کتاب مختصر قدوری ۲۲۳
نام ونسب: ۲۲۳
وفات: ۲۲۳
دفن: ۲۲۳
وجہِ لقب: ۲۲۳
اولاد اور وجہِ تالیف: ۲۲۴

بغداد کا علمی ماحول: ۲۲۴
اساتذہ: ۲۲۵
شاگرد: ۲۲۵
امام قدوری کا علمی مقام اور علما کی مدح سرائی: ۲۲۷
امام قدوری کی تصنیفات: ۲۲۸
آپ کی چند کتابوں کا ذکر: ۲۲۸
مختصر القدوری کی مزیت و منزلت اور علما کی اس پر ثنا و توصیف: ۲۲۹
اندازِ بیان: ۲۳۲
مختصر القدوری کی شروحات: ۲۳۳
نور الایضاح اور صاحبِ نور ایضاح: ۲۳۵
نام و نسب: ۲۳۵
پیدائش: ۲۳۵
تحصیلِ علم: ۲۳۵
اساتذہ: ۲۳۵
تلامذہ: ۲۳۶
تدریس: ۲۳۷
حضرت مصنفؒ کے بارے میں علماء کے اقوال اور ان کا فقہی مقام: ۲۳۷
بیعت: ۲۳۸
اسفار: ۲۳۹

وفات: ۲۳۹
تصنیفیں: ۲۳۹
کتاب کا تعارف: ۲۴۰
وجہِ تسمیہ: ۲۴۰
مقبولیت واہمیت: ۲۴۱
وجہِ تالیف: ۲۴۲
منہجِ کتاب واسلوبِ بیان: ۲۴۲
نورالایضاح کی شرحیں اور حاشیے: ۲۴۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از: حضرت مولانا مفتی محمد رضوان صاحب اعظمی قاسمی
شیخ الحدیث مدرسہ فائن ٹچ

الحمد لله وحده والصلاة والسلام علىٰ مَن لا نبيَّ بعده، أمّا بعد:

فقہِ اسلامی علومِ اسلامیہ کا ایک عظیم سرمایہ ہے، قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کا اِسے نچوڑ اور خلاصہ کہہ سکتے ہیں، ایک مسلمان کے لیے عملی زندگی بغیر فقہی معرفت کے ممکن نہیں، فقہ در حقیقت عملی احکامات سے ہی بحث کرتی ہے، فقہ استنباط واستخراج اور عملی تطبیق کا ایک مظہر ہے، اسلاف واکابر نے اس علم کی تدوین وترویج میں اپنی زندگیاں صرف کیں اور اسے بامِ عروج پر پہنچایا، فقہِ حنفی کو اللہ نے شہرت وعمومیت کی دولت سے نوازا اور دنیا کے بڑے حصے میں مسلمان اس کے پیروکار ہیں۔

فقہ ایک اجتہادی عمل، تدبّر وتفکر کی جولان گاہ اور بصیرت کی گہرائی وگیرائی کا میدان ہے، اس سے شُدبُد پیدا کرنا، اس کے اَسرار ورُموز سے واقفیت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اِس بحرِ ناپیدا کنار کی غوّاصی سے پہلے فنی تیراکی کے اصول وآداب اور بنیادی مفاہیم سے آگاہی از حد ضروری ہے۔

اِسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارے بڑے ہی محترم رفیق ''مفتی محمد یحیی صاحب'' دام اقبالہ سابق استاذِ فقہ وحدیث ادارہ دینیات فائن ٹچ ممبئی نے ''مبادیاتِ فقہ'' کے عنوان سے یہ رسالہ ترتیب دیا ہے، جو علماء وطلبہ کی فقہی ضرورت کی تکمیل کرے گا اور فقہی مصطلحات

ومقدّمات کے حوالے سے بصیرت عطا کرے گا۔اِن شاء اللہ

ربِّ کریم سے دعا ہے کہ مؤلف کی اس کاوش کو قبول فرمائے، علماء وطلبہ کے لیے اِسے نافع بنائے اور مؤلف کے حق میں ذخیرۂ آخرت اور صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المُرسلين محمدٍ وعلى آله وأصحابه أجمعين، أمَّا بعد:

فقہِ اسلامی شریعتِ مطہرہ کا وہ عملی نظام ہے جو انسان کی زندگی کے تمام گوشوں کے لیے راہِ ہدایت فراہم کرتا ہے۔ یہ علم دراصل قرآن و سنّت، اجماع اور قیاس پر قائم ایک منظّم فکری و شرعی سرمایہ ہے جس کی بنیاد پر اُمّت کے دینی، اخلاقی اور اجتماعی معاملات استوار ہیں۔

علمِ فقہ کے مبادیات، تاریخ و تدوینی ادوار سے واقفیت ہر طالبِ علمِ شریعت کے لیے ناگزیر ہے، قدیم و جدید تمام اہلِ علم نے اس کے مبادیات (یعنی بنیادی اصول و مقدمات اور تاریخ و تدوین) پر گفتگو کی ہے تاکہ طلبہ اور اہلِ علم کو فقہ کے مطالعہ میں ایک مضبوط بنیاد حاصل ہو۔

اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ مجموعہ ''مبادیاتِ فقہ: تاریخ فقہ، احوالِ ائمہ اور ضروری فقہی فوائد'' مرتب کیا گیا ہے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے جامع، مختصر اور نافع ہوگا۔ ان شاء اللہ

عرصہ ہوا مرحوم و مغفور مولانا حفظ الرحمن صاحب پالنپوریؒ (اوّل و سابق شیخ الحدیث مدرسہ فائن ٹچ؛ ممبئ) نے بندہ کو حکم دیا تھا کہ فقہ کے مبادیات مجھے جمع کرکے دیجیے۔ آں محترم کو وہ مبادیات اپنی ایک شرح کے شروع میں بطورِ مقدمہ کے درکار تھیں جو آپ کسی فقہ کی کتاب کی لکھ رہے تھے۔

راقم الحروف نے اس سلسلے میں چند کتابوں کی ورق گردانی کی تو یہ مناسب سمجھا کہ استاذ

محترم حضرت مولانا الیاس صاحب دیسائی مدظلہ (استاذِ حدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین؛ ڈابھیل) کی لکھوائی ہوئی مبادیات کو بنیاد بنا کر ان مباحث کو پھیلا دیا جائے۔

لہٰذا متعدّد مستند اردو عربی کتابوں سے اقتباسات لے کر ایک غیر مرتب مجموعہ نقل کرلیا اور پھر ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کرلیا۔ کوشش اس بات کی کی ہے کہ راقم کے الفاظ نہ آنے پائیں یا کم سے کم آئیں۔

یہ مجموعہ مولانا مرحوم کے سپرد کردیا گیا، آپ نے بہ نظرِ استحسان دیکھا لیکن دنیائے ناپائے دار و بے اعتبار نے وفا نہیں کی اور آپ اس سے لاک ڈاون میں منہ موڑ کر چلے گئے۔ مبادیات کی طباعت باقی رہی، اب بتوفیقِ ایزدی ارادہ ہوا کہ ان کو طبع کرکے شائع کیا جائے۔

یہ کتابچہ اس لائق تھا کہ اس کو کسی عمدہ شرح کے شروع میں رکھا جائے، مستقلاً و منفرداً طباعت اس وجہ سے مناسب نہیں تھی کہ اس کے تمام مباحث بزرگوں کی کتابوں میں مذکور ہیں، وہاں سے ہو بہو نقل کیے گئے ہیں۔ البتہ سہولت پسند طبیعتوں اور اختصار چاہنے والے طالبوں کے لیے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہوسکتے ہیں۔ اس لیے اس کی طباعت کا معاملہ آخری مرحلہ پر پہنچ کر آپ کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔ وللہ الحمد

ہم نے ہر مباحث کے آخر میں ماخوذ منہ کتاب کا حوالہ دے دیا ہے۔ اکثر ہم نے مندرجہ بالا کتابوں سے اقتباس نقل کیے ہیں: تاریخِ علمِ فقہ، فقہِ اسلامی تدوین و تعارف، مقدمہ بر ہدایہ (مطبوعہ: المَكتبة البُشریٰ)، تاریخِ تدوینِ فقہ، تاریخِ فقہ اسلامی، ارمغانِ حق، أصول الإفتاء وآدابه، تحفۃ الالمعی، توضیحات شرح مشکاۃ، بدر اللیالی، تحفۃ العبقری، آسان اصولِ فقہ، آسان فقہی اصطلاحات، فتوی؛ تعارف اصول و آداب، فتاویٰ نویسی کے رہنما

اصول، الاوزان المحمودۃ، صحیح ترین مسافتِ سفر، ثمرۃ الاوزان۔

یہ کتابچہ اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے اندر علمِ فقہ کی ابتدائی بنیادوں کو نہایت واضح انداز میں سمیٹے ہوئے ہے۔ طلبہ کے لیے یہ ایک علمی تحفہ اور فقہ کے سمندر میں قدم رکھنے کے لیے پہلا زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، اس کے نافع اثرات عام کرے، اور اسے راقم، اساتذہ، معاونین اور تمام قارئین کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو فقہِ حنفی کی طرح حسنِ قبول عطا فرمائے اور راقم، معاونین اور قارئین کے لیے مفید اور ذریعۂ آخرت بنائے۔ آمین یارب العالمین

محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ قاسمی

خادم تدریس مدنی مدرسہ جوگیشوری

خادم دار الافتاء والارشاد اندھیری

۱۶/ اکتوبر ۲۰۲۵ء مطابق ۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

رؤسِ ثمانیہ:

ہر علم وفن کے شروع کرنے سے پہلے چند امور بطورِ مبادی ومقدمہ کے بیان کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس علم وفن کی تحصیل میں طالب کے لیے سہولت پیدا ہوجاتی ہے، وہ امور آٹھ ہیں جن کو حکماء ومناطقہ کی اصطلاح میں ''رؤسِ ثمانیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض حضرات دس بیان کرتے ہیں۔

(۱)علم کی تعریف (۲)موضوع (۳)غرض وغایت (۴)اسماء (۵)ما بہ الاستمداد (۶)حکم الشارع (۷)فضیلت (۸)نسبت (۹)مسائل (۱۰)مؤلف ومدوِّن۔

ان کو بعض حضرات نے مذکورہ اشعار میں جمع کیا ہے:

إنَّ مَبادی كلَّ فنٍ عشرةٌ والحدُّ والمَوضوعِ ثمَّ الثمرةُ

النِّسبةُ و فَضْلُه و الوَاضِعُ والاِسمُ والاِسْتِمْدَادُ و حكمُ

مَسائل والبعض بالبعض اكتفیٰ ومن دریٰ الجميعَ حازَ الشرفَا

مبادی:

المَبادي: هی الأشياء التی يَبتنی عليها العلم.

یعنی وہ اشیاء جن پر علم کے حصول کا مدار ہے۔

لفظِ مقدمہ کا مطلب:

المُقدمة: مِن قدم وهي مأخوذة من مقدمة الجيش، وهي نوعان: مقدمة العلم ومقدمة الكتاب.

یعنی مقدمہ ماخوذ ہے مقدمۃ الجیش سے، گذشتہ زمانوں میں جب رُوبرو لڑائی ہوتی تھی تو لشکر کے پانچ حصے کیے جاتے تھے اور ان کو مقدمہ، قلب، مَیمنہ، مَیسرہ اور ساقہ کہا جاتا تھا۔ لشکر کا امیر قلب میں رہتا تھا اور مقدمہ میں لشکر کے بہادر اور چنندہ افراد ہوتے تھے جو آگے چل کر لشکر کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچاتے تھے، اس لیے جو معلومات کسی کتاب یا فن کو شروع کرنے کے لیے بہم پہنچائی جاتی ہیں ان کو بھی "مقدمہ" کہتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ کتاب یا فن کو سمجھنے میں مدد ملے۔

مقدمہ کی دو قسمیں ہیں: مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب۔

(۱) **مقدمۃ العلم:** ان مخصوص باتوں کو کہتے ہیں جن کا جاننا علم کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔

(۲) **مقدمۃ الکتاب:** ان باتوں کو کہتے ہیں جن کو کتاب میں مقصود سے پہلے اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ مقصود کتاب کو ان باتوں سے خاص تعلق ہے اور ان کے ذریعہ کتاب سے نفع تام حاصل کر سکتے ہیں۔

لفظِ فقہ کے لغوی واصطلاحی معنیٰ:

لغۃً فقہ چند معانی کے لیے مستعمل ہے:

(۱) الفهم: جیسے باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالُوا يَاشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا﴾ [هود:۹۱]

"ترجمہ: لوگوں نے کہا اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہمیں سمجھ میں نہیں آتیں ہم تو تم کو اپنے میں کمزور ہی دیکھ رہے ہیں۔"

(۲) العلم: جیسے باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ [التوبة:۱۲۲]

ترجمہ: ’’مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب نکل جائیں، پس ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کے بڑے گروہ میں سے ایک چھوٹا گروہ نکل جاتا تاکہ [جو لوگ رہ جائیں] وہ دین کا علم حاصل کریں۔‘‘

(۳) مہارت وذکاوت: جیسے کہ ایک اثر ہے:

إنَّ حذيفة وسلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما قالا لامرءة أعجمية: أ هٰهُنا مكانٌ طاهرٌ نُصَلِّ فيه؟ فقالت: طهِّر قلبَكَ و صَلِّ حيثُ شئتَ، فقال أحدهما لصاحبه: فقهت. (ابن أبي شيبة:۳۷۴۰۱)

ترجمہ: ’’حضرت حذیفہ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہما نے ایک عجمی عورت سے کہا: کیا یہاں پاک جگہ ہے جہاں پر نماز پڑھیں؟ اس عورت نے کہا کہ تم اپنے دل کو پاک کرلو اور جہاں چاہو نماز پڑھ لو۔ تو ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا کہ یہ عورت تو کافی سمجھ دار اور ذکی ہے۔‘‘

علّامہ خیر رملی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فقِہ بالکسر کہا جاتا جب کہ صرف سمجھے اور فقَہ بالفتح کیا جاتا ہے جب سمجھنے میں دوسرے سے سبقت لے جائے اور فقُہ بالضم کہا جاتا ہے جب کہ وہ ماہر فقیہ ہو جائے۔

يقال فِقهٌ بالكسر إذا فهم وفَقهٌ بالفتح إذا سبق غيره إلى الفهم وبالضم إذا صار فقيهاً.

علّامہ رشید رضا مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے:

''قرآن پاک میں یہ مادہ (فقہ) بیس جگہ استعمال ہوا ہے جس میں سے انیس جگہ اس کا مدلول ایک ایسی مخصوص قسم کی دقتِ فہم اور علمی گہرائی ہے جس پہ فائدہ مرتب ہو۔''

بعض علماء فرماتے ہیں: فقہ کے لغوی معنیٰ کسی شئ کو کھولنا، واضح کرنا، کسی چیز کا جاننا پھر یہ علم شریعت کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔

فائدہ: تعریف کا مقصد اجمالی تعارف ہے ورنہ فن مجہول رہتا ہے اور مجہول چیز کا حصول عقلاً محال ہے اس لیے تعریف کے ذریعہ فن کو جہالت سے نکالنا ہوتا ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف:

پہلے فقہ کی ایک عام تعریف کی جاتی تھی جس میں بہت سے علوم شامل ہوتے تھے اور وہ تعریف قرون مشہود لھا بالخیر کے زیادہ مناسب بھی تھی۔ چنانچہ حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علمِ فقہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

الفقه: معرفة النفس مالها وماعليها.

ترجمہ: ''انسان کا جان لینا کہ اس کے لیے کیا مفید ہیں اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔''

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے فقیہ کی تعریف منقول ہے:

الفقيه: الزاهدُ فى الدنيا، الراغبُ فى الأخرة، البصيرُ بعيوب نفسه.

ترجمہ: ''فقیہ وہ ہے جو دنیا سے بے رغبت اور آخرت میں بارغبت ہو اور اپنے نفس کے عیوب کو دیکھنے بھالنے والا ہو۔''

لیکن پھر بعد میں اکثر علماء کی رائے جس تعریف پر ٹھہری وہ یہ ہے:

الفقه: هو العلمُ بالأحكامِ الشرعيَّةِ الفَرعيَّةِ المُكتسَب من أدلتها التفصيلية.

ترجمہ: ”احکامِ شرعیہ فرعیہ کا وہ علم جو ادلہ مفصلہ یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے حاصل ہو۔“

تعریف میں فوائدِ قیود:

تعریف میں ”شرعیہ“ کی قید احترازی ہے جس سے علومِ عقلیہ، عرفیہ، حسیہ خارج ہو گئے، جیسے: ”عالَم حادث ہے“ ہم نے عقل سے جانا ہے، یہ ”علمِ عقلی“ کہلاتا ہے۔ جیسے: علمِ منطق، فلسفہ۔ اور وضع واصطلاح سے معلوم ہونے والی باتیں، جیسے: الفاعلُ مرفوعٌ ”علومِ عرفیہ“ کہلاتے ہیں۔ آگ جلانے والی ہے یہ ہم کو حس سے معلوم ہوتا ہے، یہ ”علمِ حسّی“ ہے۔

تعریف میں ”فرعیہ“ کی قید بھی احترازی ہے جس سے ”احکامِ شرعیہ اعتقادیہ“ جیسے ”اجماع حجت ہے، اس پر ایمان واجب ہے“ وغیرہ خارج ہو گیا۔

ادلۂ تفصیلیہ سے مراد: کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ ﷺ، اجماع اور قیاس ہے۔

صاحبِ مفتاح السعادۃ نے اس طرح تعریف کی ہے:

هو علمٌ باحثٌ عن الأحكام الشرعيةِ الفرعيةِ العمليةِ حيثُ استنباطِها من الأدلةِ التفصيلية.

ترجمہ: ”فقہ وہ علم ہے جس میں ان شرعی احکام سے بحث کی جاتی ہے جو مسائل فرعیہ و عملیہ ہیں ان کے ادلۂ تفصیلیہ سے استنباط کرنے کی حیثیت سے۔“

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعریف کی ہے:

معرفةُ الفروعِ والوقوفِ علىٰ دقائقَ عِلَلِها.

ترجمہ: ”فروع [مسائلِ فرعیہ] کی پہچان اور اس کی علّتوں کی باریکیوں پر مطلع ہونا۔“

(۲)علمِ فقہ کا موضوع:

موضوع کہا جاتا ہے: مایُبحثُ فی ذٰلك العلمِ عن عَوارِضِه الذاتیَّةِ. یعنی جس علم میں جن عوارضِ ذاتیہ سے بحث کی جاتی ہے اس کو اس علم کا موضوع کہا جاتا ہے۔ جیسے علمِ طب میں بدنِ انسانی سے بحث کی جاتی ہے کہ گرم ہے یا سرد ہے وغیرہ، علمِ طب کے مباحث بدنِ انسانی کے اردگرد ہی گردش کرتے ہیں۔

موضوع کے ذریعہ فنون میں آپس میں اُمتیاز ہوتا ہے، ان کی شرافت وعظمت موضوع کے ذریعہ ہوتی ہے اس لیے موضوع جتنا اونچا ہوگا فن اتنا ہی اونچا ہوتا ہے۔

علمِ فقہ کا موضوع ہے: ''فِعل المکلّفِ ثُبوتاً وسَلْباً مِن حیثُ التکلیفِ'' یعنی مکلّف کے افعال باعتبار ثبوت وسلب کے مکلّف ہونے کی حیثیت ہے۔

وضاحت: فقہ میں مکلّف کے افعال کو جو حلّت وحرمت، وجوب وندب عارض ہوتے ہیں اس سے بحث کی جاتی ہے۔ مکلّف کی قید سے معلوم ہوگیا کہ غیر مکلّف کا فعل علمِ فقہ کا موضوع نہیں ہے اور مکلّف سے مراد عاقل بالغ ہے اس لیے بچہ اور مجنون کے تلف کردہ چیزوں کا ضمان اور ان کی بیویوں کے نفقہ کا مکلّف ولی ہوتا ہے نہ کہ بچہ اور مجنون۔ اور جانوروں کے اِتلاف کی وجہ سے جانوروں کے مالک سے ضمان لیا جاتا ہے۔

سوال: دس سالہ بچہ کو نماز کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کی نماز پر صحت کا حکم لگایا جاتا ہے، اسی طرح روزہ کا بھی حکم ہے اور اس کا ثواب بھی اس کو دیا جاتا ہے، حالاں کہ بچہ مکلّف نہیں تو پھر اس سے فقہ میں بحث کیوں کی جاتی ہے؟

جواب: یہ حکم مکلّف ہونے کی حیثیت سے نہیں دیا جاتا بلکہ عادت کے لیے دیا جاتا

ہے۔ تاکہ وہ بالغ ہوکر نماز ترک نہ کرے ”مکلّف ہونے کی حیثیت سے “قید اس لیے لگائی تاکہ مکلّف کے وہ افعال جو من حیث التکلیف نہ ہو، خارج ہوجائیں، جیسے: مکلّف کے وہ فعل اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ کیوں کہ یہ علمِ فقہ کا موضوع نہیں ہے۔

وجوب و تحریم میں تکلیف ثبوتاً ہوتی ہے یعنی تکلیف موجود ہے مکلّف بنایا گیا ہے، مباح و مندوب میں تکلیف سلباً ہوتی ہے کیوں کہ فعل اور ترک فعل جائز قرار دینا وہ بندہ کی کُلفت کو رفع کر دیتا ہے (سلب کر دیتا ہے)، اب چوں کہ مباح و مندوب بھی علمِ فقہ کا موضوع ہے ان کو داخل کرنے کے لیے سلباً کی قید لگائی۔

(۳) غرض وغایت:

غرض کہتے ہیں اس مقصد اور نتیجہ کو جس کے حاصل کرنے کے لیے کوئی فعل کیا جائے، مثلاً بازار جاکر کوئی چیز خریدنا اور غایت وہ نتیجہ ہے جو اس پر مرتب ہو، لہٰذا بازار سے کسی شئ کو خریدنے کے لیے جانا تو غرض ہے اور اس شئ کا خریدنا غایت ہے۔

غرض وغایت دونوں مصداق کے اعتبار سے ایک ہیں صرف ابتدا اور انتہا کا فرق ہے، چنانچہ عقلاء اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک غرض وغایت ایک ہی ہے، کیوں کہ ان کے یہاں اکثر غرض پر غایت مرتب ہوتی ہے، بہ خلاف بیوقوفوں واحمقوں کے کہ ان کے یہاں غرض پر غایت بہت کم مرتب ہوتی ہے۔

علمِ فقہ کی غرض وغایت:

الفوزُ بسعادة الدارَین یعنی دارین کی نیک بختی حاصل کرکے بامراد ہونا، دارین سے مراد دنیا وآخرت، دنیا کی کامیابی تو یہ ہے کہ فقہ سے احکامِ شرع کے علم سے ماموارت پر عمل

ہوگا اور منہیات سے اجتناب، خود بھی دنیا میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچانے گا اور خود عمل کر کے دوسروں کو تعلیم دے کر آخرت میں اعلیٰ درجہ حاصل کرے گا۔ نیز فقہ کا حاصل کرنے والا دنیا میں جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی حاصل کرتا ہے اور اِنشراح کے ساتھ احکام دین پر عمل کرتا ہے۔

(۴) اسماء:

یعنی اس فن کو دوسرے کن ناموں سے یاد کیا جاتا ہے؟ چوں کہ ان میں حلال و حرام، مکروہ و ناجائز وغیرہ احکام ہیں اس لیے اس کو علم حلال و حرام بھی کہا جاتا ہے، پھر اس کو علمِ فقہ، علمِ فتاویٰ، علمِ احکام اور علمِ آخرت بھی کہتے ہیں۔

(۵) مابہ الاستمداد: استمداد، استفعال کا مصدر ہے، مادہ مدّ ہے، سین طلب کے لیے ہے۔ استمداد کے معنی ہوئے "مدد طلب کرنا"۔ مابہ الاستمداد کے معنٰی ہے "وہ چیز جس سے علمِ فقہ میں مدد طلب کی جاتی ہے"۔ بہ لفظِ دیگر فقہ کا ماخذ یا مابہ الاستمداد کیا ہے؟ وہ چار چیزیں ہیں: (۱) کتاب اللہ (۲) سنّت رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم (۳) اجماع (۴) قیاس، اس وجہ سے ان چاروں کو "اصولِ فقہ" کہتے ہیں۔

حضرت معاذ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ والی حدیث اسی طرف مشیر ہے کہ جب ان کو والیِ یمن بنا کر بھیجا جارہا تھا تو حضرت نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے استفسار کیا:

بما تقضى يا معاذ! قال بكتاب الله تعالىٰ، قال: فإن لم تجد؟ قال بسنّة رسول الله، قال: فإن لم تجد قال اجتهد برأْيي، فصوّبه رسول الله ﷺ فقال: الحمد لله الذى وفّق رسولَ رسولِ الله على مايحب ويرضى.

ترجمہ: رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا: "اے معاذ! تم فیصلے کس چیز کے مطابق کروگے؟"

انہوں نے عرض کیا: ”اللہ کی کتاب کے مطابق“۔ ”آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر اس میں نہ پاؤ تو؟“ انہوں نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ کی سنّت کے مطابق“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر اس میں بھی نہ پاؤ تو؟“ انہوں نے کہا: ”تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا“۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے جواب کو درست قرار دیا اور فرمایا: ”تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اللہ کے رسول کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کو پسند اور منظور ہے۔“

(۶) حکمِ شارع: یعنی علمِ فقہ کو پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

دین پر عمل کرنے کے لیے جن مسائل کا جاننا ضروری ہے ان کا سیکھنا اور حاصل کرنا ”فرضِ عین“ ہے۔ بچہ بالغ ہوتا ہے تو طہارت و نماز کے صحیح پڑھنے کے مسائل، روزہ کے مسائل، اس طرح مالدار ہو تو زکوٰۃ و حج کے ضروری مسائل کا سیکھنا ”فرضِ عین“ ہے۔ اور باقی جزئیات اور فروعات کا جاننا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ”فرضِ کفایہ“ ہے۔

اور جب دوسروں کو بتلانا ہو تو اگر کسی بستی میں فقہ کے مسائل بتلانے والا کوئی موجود نہیں اور اس علم کے حصول کی استعداد رکھنے والا ایک ہی شخص ہے تو ”فرضِ عین“ ہے ورنہ ”فرضِ کفایہ“ ہے۔

(۷) فضیلت:

(یہاں مختصراً ذکر کی جاتی ہے، آگے بالتفصیل آرہی ہے ان شاء اللہ)

(۱) قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ [البقرۃ:۲۶۹]

ترجمہ: ”اللہ جسے چاہتے ہیں دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں اور جس کو دین کی سمجھ دی گئی اس کو بہت سی خیر دی گئی۔“

بہت سے مفسرین نے حکمت سے مراد فقہ لیا ہے، پس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ جس کو فقہ دیا گیا اس کو خیرِ کثیر دیا گیا۔

(۲)قال رسول اللہ ﷺ: مَن یُرِدِ اللّٰہُ بہ خیراً یُفَقِّهُ فی الدین. (بخاری)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے اس کو فقہ فی الدین عطا فرماتے ہیں۔" یعنی دین کی صحیح سمجھ عطا فرماتے ہیں چاہے؛ وہ ظاہری شریعت سے متعلق ہو یا طریقت سے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے تمام لوگوں پر علماء کی فضیلت اور تمام علوم سے تفقہ فی الدین کا افضل ہونا ظاہر ہو گیا۔

حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے: یا معشرَ الفقهاء أنتم الأطِبَّاء ونحن الصیادلة.

اے فقہاء! تم طبیب ہو اور ہم دوا فروش۔

حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "جس حدیث کو فقہاء نقل کریں وہ اس سے بہتر ہے جو محض محدث روایت کرتے ہیں۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "حدیث میں تفقُّہ میرے نزدیک حفظِ حدیث سے زیادہ محبوب ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "قرآن وحدیث کے بعد اسلام کا مدار فقہ پر ہے۔"

(۳)عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: فقیهٌ واحدٌ أشدُّ علی الشیطان مِنْ ألفِ عابدٍ. (رواہ الترمذي وابن ماجة)(۱)

(۱)قال الربیع: رواہ هذا الحدیث البیهقيُّ فی الشعب والطبراني فی الأوسط وغیرهما من حدیث أبي هریرة مرفوعاً به فی حدیث، وقال الطبراني سنده ضعیف وله شواهد أسانیدها ضعیفة انتهی. لکن کثرة طُرُقِه تُخْرِجُه عن الضعف خصوصاً حیث المُعتضد بروایة الترمذی وابن ماجة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما.(مرقاة)

ترجمہ: ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہوتا ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ عابد کے زہد وتقوی اور عبادت سے خود کو فائدہ پہنچتا ہے مگر دوسرے لوگوں کو نہیں اور فقیہ حلال وحرام اور دیگر مسائل کو تعلیم دے کر لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ نیز عابد کو تو شیطان گمراہ آسانی سے کر سکتا ہے کیوں کہ اس کو شیطان کی تلبیسات اور اغوائے شیطانی کا علم نہیں ہے مگر فقیہ مسائل وتلبیسات جاننے کی وجہ سے اکثر اوقات گمراہی سے بچ جاتا ہے۔

(۴)وعن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: مجلس فقهٍ خيرٌ من عبادة ستين سنَة. (راوه الطبراني)

ترجمہ: ”فقہ کی مجلس میں شرکت ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔“
ملحوظہ: قرآن پاک میں جہاں فقہ کی فضیلت آئی ہے وہاں ایک بات ملحوظ رکھنی چاہیے وہ یہ کہ زمانۂ نبوت میں جہاں فقہ کا اطلاع ہوتا تھا وہاں اس سے مراد موجودہ اصطلاحی فقہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا طلاق عمومی ہوتا تھا، ظاہرِ شریعت، طریقت ومعرفت سب کو شامل تھا، اس لیے امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف: ”معرفة النفس مالها وما عليها“ (آدمی کا اپنی مفید اور مضر چیزوں کا جاننا۔) کی ہے۔

(۵) ورُوي أن رجلاً قدِم من الشام إلى عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقال له: ما أقدمَك؟ قال: قدمتُ لِأتعلَّم التشهد، فبكىٰ عمرُ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حتى ابْتلَّتِ اللِّحْيَةُ، ثم قال: والله إِني لَأَرْجُوْ من الله أَنْ لا يعذبَكَ أبداً. (بدائع الصنائع)

ترجمہ: روایت ہے کہ ایک شخص شام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تمہیں کس چیز نے یہاں آنے پر آمادہ کیا؟ اس نے کہا میں تشہد سیکھنے کے لیے آیا

ہوں، یہ سن کر آپ اس قدر روئے کہ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ تجھے کبھی عذاب نہ دے۔)

(۸) نسبت و مرتبہ:

علوم کی اجناس مقرر ہیں اور مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علم کی تقسیم مختلف حیثیات واحوال کے ساتھ کی گئی ہے، مثلاً ایک قسم علم کی باعتبار عقلیات ونقلیات کے ہے کہ آیا یہ علم عقلی ہے یا نقلی؛ جیسے: منطق وفلسفہ عقلی ہیں اور جغرافیہ تاریخ وغیرہ نقلی، اس معنیٰ کے اعتبار سے علمِ فقہ کی جنس نقلی ہے۔

ایک تقسیم علوم کی اصلی وآلی ہونے کے اعتبار سے ہے کہ آیا یہ علم مقصود اصلی ہے یا دوسرے کسی علم کے لیے آلہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس اعتبار سے علمِ فقہ کی جنس ونسبت اصلی ہے۔

ایک تقسیم علوم کی شرعی وغیر شرعی ہونے کے اعتبار سے ہے، اس اعتبار سے علمِ فقہ کی جنس شرعی ہوئی تواب خلاصہ یہ نکلا کہ علمِ فقہ کی جنس اور فقہ دوسرے علوم کی طرف نسبت کرتے ہوئے نقلی، اصلی، شرعی علوم میں سے ہے۔

علمِ فقہ کا مرتبہ دو اعتبار سے ہے: ایک باعتبارِ فضیلت دوسرا باعتبار تعلیم وتعلم۔

فضیلت کے اعتبار سے علمِ فقہ کا نمبر تیسرا ہے، ترتیب یہ ہے: (۱) قرآن پاک (۲) حدیث (۳) فقہ۔ لیکن باعتبار تعلیم وتعلم ان علومِ ثلاثہ کا نمبر آخر میں ہے۔ پہلے اُن علوم کو حاصل کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے عربی سے مناسبت پیدا ہو؛ جیسے: صرف، نحو وغیرہ، کیوں کہ یہ سب علومِ آلیہ ہیں اور آلہ کے درجہ میں ہیں اور آلہ مقدم ہوا کرتا ہے اور اصل مقصد مؤخر۔

(۹) مسائل:

علمِ فقہ کا ہر مسئلہ اس طرح مرتب ہوگا کہ اس کا مبتدا مکلّف آدمی کے افعال میں سے کوئی ایک فعل ہوگا اور اس کی خبر ان چیزوں میں سے کوئی ایک ہوگی (۱) مباح، جیسے: الاصطیادُ مباحٌ (۲) واجب، جیسے: الوضوء واجبٌ (۳) فرض، جیسے: صلاة الوقتِ فرضٌ (۴) حرام، جیسے: شُربُ الخمرِ حرامٌ (۵) مکروہ، جیسے: البیعُ عند أذان الجمعةِ مکروہٌ۔

(۱۰) واضع ومدوّن:

واضع ومدوِّن علمِ فقہ: سراج الائمہ، امام الائمہ، امامِ اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: النَّاس عِیالُ أبی حنیفةَ فِی الْفِقْهِ. یعنی لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اوّلاد ہیں۔

لیکن ترتیب فقہ کا سلسلہ اس طرح ہے:

قالوا : الفقهُ زَرَعه عبدُ الله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه و سَقَاه علقمةُ وحَصَدَه إبراهيمُ النخعيُّ وَ دَاسَه حمّاد و طَحَنَه أبوحنيفةَ و عَجَنَه أبويوسف و خَبَزَه محمَّدٌ فَسَائِرُ النَّاسِ يَأْكُلُونَ مِن خُبْزِه. (رحمة الله عليهم)

ترجمہ: علمِ فقہ کی تخم ریزی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کی، اور اس کی آب پاشی حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کاٹا اور حضرت حمّاد رحمۃ اللہ علیہ نے گاہا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پیسا اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گوندا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو روٹیاں پکائی، تمام لوگ ان کی پکائی ہوئی روٹیاں کھا رہے ہیں۔

یعنی سب سے پہلے جو شخص فقہ کی فروعات کے استنباط کی بات کرنے والے ہوئے، وہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

اوراس علم کی آبیاری، توضیح اور تقویت علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔

اوراس کے منتشر فوائد اور نکتوں کو جمع کر کے فائدہ اٹھانے کے قابل بنایا ابراہیم بن یزید بن اسود ابو عمران نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے۔

اوراس کی مزید تنقیح و وضاحت میں جدا اجتہاد کیا حمّاد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کوفی نے۔

اور اصول کی کثرت کی، فروع کو تفصیل سے بیان کیا اوراس کے راستوں کو واضح کیا امام الائمہ، سراج اُمّت امامِ اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے۔

اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قواعد و اصول میں گہری نظر ڈالی، ان سے مزید فروع و احکام کے استنباط میں اجتہاد کیا اور ان کے راستہ کو واضح کیا امامِ اعظم کے شاگرد خاص، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے۔

اور فروع کے مزید استنباط، ان کی تنقیح اور تہذیب اس درجے تک کی کہ مزید کسی چیز کی حاجت باقی نہ رہی، یہ کام امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔

مختصر سوانح ائمۂ اربعہ اور فقہِ حنفی کے عمود اربعہ

۱) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ:

مکمل نام: امام دارالھجرۃ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر، آپ کا سلسلۂ نسب یمنی قبیلہ "ذی اصبح" تک منتہی ہوتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں ایک شخص یمن سے مدینہ منورہ آکر آباد ہو گئے تھے، ان کے پردادا ''ابو عامر'' صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک ہوئے تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۹۳ھ مدینہ منورہ میں ہوئی مدینہ ہی میں علم حاصل کیا۔ سب سے پہلے عبدالرحمن بن ہرمز سے حدیث پڑھی پھر زہری، نافع، ابن ذکوان اور یحیی بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیثیں سنیں، فقہ کی تعلیم فقیہ حجاز ربیعۃ الرائے سے پائی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو جب ان کے شیوخِ حدیث وفقہ نے روایتِ حدیث وافتاء کی اجازت دے دی تو مسندِ روایت وافتا پر بیٹھے، فرماتے ہیں: جب تک ستر شیوخ نے میری اہلیت کی شہادت نہ دے دی میں مسندِ درس وافتاء پر نہیں بیٹھا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث کے بھی مسلم امام ہیں، ان کے شیوخ مثلاً ربیعۃ الرائے، یحیٰ بن سعید، موسیٰ بن عقبہ، اور ان کے معاصرین مثلاً سفیان ثوری، لیث، اوزاعی، ابن عیینہ اور تلامذۂ ابی حنیفہؒ مثلاً عبداللہ بن مبارک، ابویوسف، محمد بن حسن رحمھم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے بھی ان سے حدیث روایت کی، امام شافعیؒ نے بھی ان سے حدیث پڑھی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے اہم تالیف حدیث میں موطا ہے، جس کو ان سے ہزار آدمیوں نے سنی جن میں مجتہدین، محدثین، صوفیہ، فقہاء امراء اور خلفاء سب ہی تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مجلسِ درس نہایت باوقار تھی، ساری زندگی مدینۃ الرسول میں بسر کی، کسی دوسرے شہر نہیں گئے۔ مسجد نبوی میں درس وافتاء کا شغل قائم رہا، لوگ سفر کر کے ان کے پاس آتے تھے اور ان سے حدیث وفقہ پڑھ کر جاتے تھے بالخصوص مصر اور افریقہ کے

لوگوں نے ان سے مسائل فقہ سیکھے اور اپنے وطن میں ان کے مسائل کی اشاعت کی۔

ایک واقعہ کے تحت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے منصور عباسی کے مقابل میں نفس زکیہ علوی کی اپنے فتوے سے تائید کی تھی۔ نفس زکیہ کی شہادت کے بعد منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر عباسی کو اہل مدینہ سے تجدید بیعت کے لیے بھیجا، اس کو جب امام مالک کے فتوی کا علم ہوا تو اس نے نہایت ذلت کے ساتھ دارالامارت بلوا کر مالک کو ستر کوڑے لگوائے لیکن جب منصور کو معلوم ہوا تو اس نے افسوس ظاہر کیا۔ اور اپنی معذرت کہلا بھیجی اور عراق طلب کیا، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ عراق جانے پر راضی نہ ہوئے منصور نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا، منصور جب حج کو آیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور نہایت اعزاز واکرام سے پیش آیا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بقیہ زندگی نہایت عزت کے ساتھ مدینہ میں بشغلِ درس وافتاء بسر کی اور ۱۷۹ھ میں واصل بحق ہوئے۔

۲) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ:

مکمل نام: ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عثمان بن شافع الشافعی المطلبی، آپ کی نویں پشت پر عبد مناف ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی پشت میں ہیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ ام الحسن بنت حمزہ بن القاسم بن یزید بن حسن تھیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ صوبہ عسقلان میں بمقام غزّہ ۱۵۰ھ پیدا ہوئے، دو برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ماں نے پرورش کی، دس برس کی عمر میں قرآن حکیم اور موطا کو حفظ کر لیا، پھر مکہ پہنچ کر وہاں فقیہ مسلم بن خالد زنجی سے فقہ حاصل کی، اس وقت پندرہ سال کی عمر تھی استاذ نے فتویٰ دینے کی اجازت دی، مگر استاذ سے سفارشی خط لے کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے، ان کو مؤطا سنائی اور ان سے فقہ سیکھی، مزید برآں اکیاسی (۸۱)

شیوخ سے حدیثیں سنیں۔

ہارون رشید کے عہد میں والیِ نجران ہوئے، لوگوں نے سادات کی موافقت کا الزام لگایا، گرفتار ہو کر ۱۸۴ھ میں ہارون رشید کے پاس لائے گئے لیکن فضل بن ربیع حاجب کی سفارش سے رہائی پائی اور پھر اپنے عہد پر بحال ہو گئے مگر زیادہ دیر تک وہاں نہیں رہ سکے ملازمت چھوڑ کر عراق پہنچے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں آمد و رفت شروع کی اور ان سے بسلسلۂ فقہِ حنفی استفادہ کرنے لگے۔ اس طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ طریقِ علمائے حدیث، طریقِ اہلِ حجاز بہ واسطہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور طریقِ اہلِ عراق بہ واسطہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تینوں کے جامع ہوئے، پھر مکہ واپس ہوئے اور وہاں آنے جانے والے علمائے اَمصار سے تبادلۂ خیال اور استفادۂ علمی کا مزید موقع ملا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۵ھ میں عراق آئے، اس آمد میں علمائے عراق کی ایک جماعت نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہبِ قدیم اور مذہبِ جدید:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے طریقۂ حجازیین و عراقیین و محدثین سے ملا جلا ایک مسلک مدوّن کیا، اس پر کتابیں لکھیں لوگوں کو املاء کرائیں اور اس کے مطابق فتویٰ دیا، یہ مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ''مذہبِ قدیم'' کہلاتا ہے۔ عراق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کافی شہرت حاصل ہوئی، علماء کی ایک جماعت نے ان کا یہ طریقہ قبول کیا۔ اپنے مخالفین سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مناظرے بھی کیے، ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے پھر مکہ واپس ہوئے۔

۱۹۸ھ میں مکہ سے تیسری بار عراق آئے اور چند مہینے قیام کے بعد مصر تشریف لے

گئے مصر میں امام مالک کا مذہب رائج تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علمائے مصر کے سامنے اپنا مذہب پیش کیا، مصری ماحول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی نظریے میں کچھ تبدیلی ہوئی تو انہوں نے اپنی عراقی فقہ سے کچھ بدلی ہوئی نئی مصری فقہ پر کتابیں لکھیں، یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ''مذہبِ جدید'' کہلاتا ہے۔

امام شافعیؒ ۱۹۸ھ سے ۲۰۴ھ تک برابر مصر میں رہے اور ۲۰۴ھ میں مصر ہی میں وفات پائی۔

۳) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ:

مکمل نام: ابو عبداللہ احمد بن محمد حنبل بن ھلال الذہلی المروزی

۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، دو برس کی عمر میں یتیم ہوگئے، ماں نے پرورش کی، ابتدائی عمر میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہونے لگے سولہ (۱۶) برس کی عمر میں تحصیل حدیث شروع کی، ہشیم اور سفیان بن عیینہ وغیرہ سے حدیثیں سنیں۔

۱۸۷ھ میں پہلی بار مکہ گئے، وہاں کے مشائخ سے حدیث سنی ۱۹۶ھ میں دوبارہ مکہ پہنچے، تین برس رہے پھر یمن پہنچے، عبدالرزاق سے حدیث سنی، اسی طرح مختلف بلاد میں مشائخِ کثیرہ سے سماع حدیث کرتے رہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب عراق آئے تو ان سے فقہ سیکھی، امام احمد امام شافعی کے بغدادی تلامذہ میں سب سے بڑے ہیں، درجۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور اسی زمانہ میں اپنا خاص نظریۂ فقہ قائم کیا اور اسی کے مطابق فتوے دینے لگے اگرچہ زمرۂ فقہا سے زیادہ ان کا شمار محدثین میں ہے۔

۲۱۲ھ میں عقیدۂ خلقِ قرآن کا فتنہ شروع ہوا۔ عباسی حکمراں مامون نے شیخ یحیٰ بن اکتم

محدّث رحمۃ اللہ علیہ کو عہدۂ قضا سے معزول کر کے احمد بن داؤد معتزلی کو قاضی القُضاۃ مقرر کیا، مامون متشدّد معتزلی العقیدہ تھا۔ ۲۱۸ھ میں اس نے صوبوں میں حکم بھیجا کہ محدثین سے خلقِ قرآن کا اقرار کرایا جائے۔

بغداد کے محدثین نے مخالفت کی تو مامون نے خلق قرآن سے انکار کرنے والے سات اکابر محدثین کو بغداد طلب کیا، یہ ساتوں آئے ان میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، ان میں سے چھ نے خوف سے اقرار کرلیا یا توریہ سے کام لے کر خلاصی حاصل کی۔ لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صریح مخالفت کی۔ نتیجہ میں قید ہوگئے، مامون کے انتقال کے بعد معتصم باللہ حکمراں ہوا، اس کے زمانے میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قید خانے میں سخت اذیتیں دی گئیں، درے مارے گئے بالآخر رہا ہوئے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پھر درس جاری کیا، ۲۲۷ھ میں واثق باللہ حکمراں ہوا، اس کے زمانہ میں بھی اس مسئلہ پر سختی ہونے لگی، ۲۳۱ھ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو درس موقوف کردینا پڑا، ۲۳۲ھ میں متوکل علی اللہ حکمراں ہوا، یہ محدثین کے عقیدے پر تھا، اس کے زمانہ میں محدثین کو آزادی ملی، اس نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عزت کی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲/ ربیع الاوّل ۲۴۱ھ کو ۷۷/ سال کی عمر میں وفات پائی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ:

مکمل نام: ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ آپ فارسی الاصل تھے، زوطی خلافتِ علوی میں دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے، اسلامی نام نعمان پڑا، اپنے وطن سے ہجرت کی، اسلامی حکومت کے دارالخلافۃ کوفہ پہنچے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری دی۔ وطن کا تحفہ ”فالودہ“ نذر گذار کیا اور اپنے نہایت کم سن بچے ثابت کے لیے دعا چاہی،

باب العلم علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے دعائے خیر دی۔

ثابت بڑے ہوئے توانہوں نے خز (ریشم) کی تجارت شروع کی، ۴۵ / سال کی عمر میں ۸۰ ھ کو اللہ تعالیٰ نے بابرکت فرزند عطا کیا، دادا کے نام پر نعمان نام رکھا۔ بڑے ہوئے تو باپ کی تجارت کو ترقی دی، جگہ جگہ کارخانے اور کوٹھیاں قائم کیں، اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت اور برکت دی، آخری عمر تک بڑی دولت کے مالک رہے اپنے علمی کمال کی وجہ سے امامِ اعظم کہلائے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ۱۲ / یا تیرہ سال کے تھے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر ان سے حدیث نہیں سنی۔

سترہ سال کی عمر ہوئی توتحصیلِ علم کی طرف متوجہ ہوئے، طبّاع ذہن نے عقائد کی اہمیت کے خیال سے علمِ کلام کی طرف مائل کرلیا، بہت جلد اس میں کمال وخصوصیت حاصل کرلی، اِسی زمانہ میں قرآن فہمی پر بھی امام صاحب کو کافی عبور حاصل ہو گیا، پھر وہ اس کے دیکھتے ہوئے کہ عملی دنیا میں فقہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، عوام اور حکومت سب کو اس کی ضرورت ہے، دین اور دنیا کی حاجتیں اس سے وابستہ ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے عہدِ خلافت میں فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

کوفہ اہم اسلامی شہر تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے آباد ہوا، تقریباً ۱۵۰۰ / صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں آکر بسے، جن میں ۲۴ / بدری تھے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا معلّم بناکر بھیجا تھا۔ تقریباً ۱۰ / برس تک اہلِ کوفہ ان سے مستفید رہے۔ مسائلِ فقہ اور حدیث کا چرچا گھر گھر تھا، خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنایا، ان سے بھی اہلِ کوفہ کو کافی فیض پہنچا، کوفہ چوں کے عرب وعجم کے ملتقی میں واقع تھا وہاں مختلف ثقافتیں

جمع تھیں اس لیے وہاں نئے نئے مسائل کی تحقیق ہوتی رہتی تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علوم وفتاویٰ بالواسطہ حضرت ابراھیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچے، گویا کوفہ میں وہ ان دوبزرگوں کی زبان تھے۔ ابراھیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی حضرت حمّاد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کو ملی، وہ مسائلِ نخعی کے حافظ تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ غالبًا ۱۰۰ھ میں امام حمّاد کی درسگاہ میں حاضر ہوئے، استاد نے جوہرِ قابل دیکھ کر توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی جودتِ طبع، ذھن اور قوتِ حافظہ کی وجہ سے ہمیشہ اپنے اَقران پہ سب سے فائق رہے۔ بہت جلد انہوں نے تکمیل کرلی، پھر بھی کم وبیش بیس سال تک استاذ جب تک زندہ رہے، استاد سے تعلق قائم رکھا، مسائل میں بحث وحل، تحقیق واِمعان کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ علمِ حدیث کی تحصیل کے بغیر فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جس کی ان کو طلب تھی ممکن نہیں، زمانۂ تحصیلِ فقہ میں علمِ حدیث کی طرف توجہ کی اور کوفہ کے اکثر محدثین سے حدیثیں سنی، بسلسلۂ تجارت بصرہ، شام اور دوسرے ملکوں میں بھی جانا پڑا تھا، وہاں کے مشائخِ حدیث سے حدیثیں سنیں، حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے مشاہیر ائمہ سے بھی حدیث کی سماعت کی، ابوالمحاسن رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ۹۳ھ مشاہیر مشائخِ حدیث کے نام لکھے ہیں، ابوحفص کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے ۴؍ہزار مشائخ بتائے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم حدیث کی تحقیق کے ساتھ اسی زمانہ میں دوسرے علوم میں بھی تجربہ حاصل کیا، خود فرماتے ہیں کہ میں نے جب علم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو تمام علوم

کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا اور ہر فن کو پڑھا۔

امام حمّاد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ کے جانشین ہو کر درس وافتا میں مشغول ہوئے، طلبہ کی بھیڑ رہنے لگی دور دور سے مسائل پوچھنے والوں کا ہجوم اس پر مزید تھا۔

جعفر بن ربیع کا بیان ہے: میں امام ابو حنیفہ کے یہاں پانچ سال تک رہا میں نے ان سے زیادہ خاموش آدمی نہیں دیکھا، لیکن جب ان سے فقہ کے متعلق سوال کیا جاتا تو نہر کی طرح بہنے لگتے غلغلہ انگیز گفتگو کرتے، وہ قیاس ورائے کے امام تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔

غرض امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ تھے، چند روز میں ان کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی، بڑی تعداد میں دور دور سے طلبہ پہنچنے لگے، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے طلبہ کے ساتھ نہایت ہمدرد اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور مواسات میں مشہور تھے، اسپین کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہیں تھا جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔

درس وافتاء کی مشغولیت سے بہت جلد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملک کے خواص وعوام میں مقبول ہو گئے۔ سارے ملک پر آپ کا اثر تھا، بالخصوص عراق میں آپ کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔

خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد پھر بنواُمیّہ کے مظالم بڑھ گئے دینی آزادی ختم ہو گئی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر پابندی لگ گئی جبر واستبداد عود کر آیا، امام صاحب

رحمۃ اللہ علیہ ان سے سخت ناخوش تھے۔

ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں حضرت زید بن علی حسین رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں بنی اُمیّہ کے خلاف علَمِ اصلاح بلند کیا، ابتداءً کوفہ کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی، لیکن بعد میں جماعت مختصر ہوگئی۔

کوفہ کے اموی گورنر سے جنگ ہوئی، امام زید رحمۃ اللہ علیہ ناکام ۱۲۲ھ میں شہید ہوگئے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ان کے ساتھ علی الاعلان شریک نہیں ہوئے لیکن مالی خدمت کی اور زبانی موافقت کا اظہار فرمایا۔ امام زید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد اُموی حکّام کی نظروں میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ چڑھ گئے، کھلے بندوں بلا کسی وجہ وحیلہ بنائے، ان کی عام مقبولیت کے پیشِ نظر داروگیر مشکل تھی۔

اِسی زمانہ میں عباسیوں نے بھی زور پکڑنا شروع کیا، شام کا آخری اُموی حکمراں مروان الحمار تھا۔ اس نے کوفہ کا گورنر عمر بن ھُبیرہ کو مقرر کیا، ابن ھبیرہ نے کوفہ کے فقہاء کو بڑی بڑی ملکی خدمتیں دے کر اپنا ہمنوا بنالیا، اب اس نے اس حکمتِ عملی سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا ہمنوا بنانا چاہا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے میر منشی کا عہدہ اور افسرِ خزانہ کا منصب رکھا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلے ہی ان سے ناخوش تھے، پھر یہ خیال کرتے ہوئے میر منشی کے معنٰی یہ ہے کہ حکومت کے بہت سے ظالمانہ احکام کی وہ تائید کریں اور افسرِ خزانہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیت المال کا بیجا صرفہ ان کے ہاتھوں سے ہو، انہوں نے ان عہدوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

حکومت کو بہانہ مل گیا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جیل کی سزادی، کوڑے لگوائے مگر امام

صاحب رحمۃ اللہ علیہ مستقیم الاَحوال رہے، بالآخر چھوڑ دیے گئے، چھوٹنے کے بعد ۱۳۰ھ میں امام صاحب حرمین شریفین روانہ ہوگئے اور مسلسل دو سال وہاں رہے، وہاں بھی درس و افتاء کا سلسلہ جاری رہا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر مشہور فقیہ امام زھری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد یاسین زیات کوفی رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ میں خود چلا چلا کر اعلان کیا۔

”لوگو! ابو حنیفہ کے حلقہ میں جا کر بیٹھو اور ان کو غنیمت سمجھو، ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ ایسا آدمی پھر نہیں ملے گا، حرام و حلال کے ایسے عالم کو پھر نہ پاؤ گے، اگر تم نے ان کو کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کو کھو دیا۔

عمار بن محمد کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ حرمِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے، اِرد گِرد خِلقت کا ہجوم تھا، ہر ملک اور ہر علاقہ کے لوگ مسائل پوچھتے تھے، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سب کو جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے تھے۔ صرف عوام نہیں بلکہ امام صاحب کے اِرد گِرد مسائل پوچھنے والے ہر ملک کے خواص اہلِ علم جمع رہتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے حرمِ کعبہ کی مسجد میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق و مغرب کے لوگوں کو فتویٰ دے رہے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ لوگ تھے یعنی بڑے بڑے فقہا اور اچھے اچھے لوگ اس مجلس میں موجود تھے۔

حرمین شریفین میں چوں کہ بلادِ مختلفہ کے مختلف الخیال علماء سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات ہوتی رہتی تھی، علمی صحبتیں تھیں، تبادلۂ خیال کا عمدہ موقع ملا، مختلف بلاد کے حالات، ضروریات اور مسائل سے بھی واقفیت ہوئی، اسی زمانے میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تدوینِ فقہ کا جو داعیہ پہلے تھا اب وہ راسخ ہو گیا۔

۱۳۲ھ کے بعد دولتِ بنی اُمیّہ کے خاتمہ پر فوراً کوفہ واپس ہوئے اور اپنے شاگردوں کی باضابطہ مجلسِ شوریٰ بناکر تدوینِ فقہ کی طرف پوری توجہ کے ساتھ لگ گئے۔ ظلم وتعدّی اور جبرواستبداد میں عباسیوں کی حکومت بنی اُمیّہ کی حکومت سے کم نہیں تھی، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان سے بھی خوش نہ تھے ہمیشہ ان کی اصلاح کے خواہش مند رہے۔

عباسیوں نے پہلے بنی اُمیّہ کو اپنے مظالم کا شکار بنایا پھر علوی سادات اور ان کے ہمنوا ہدف بنے۔

۱۴۵ھ میں محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی نے جو نفسِ زکیہ کے لقب سے مشہور تھے، مدینہ میں ادعائے خلافت کیا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تاکید کی مگر نفسِ زکیہ اس سال ناکام شہید ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے کا بیان ہے: میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا کہ وہ محمد بن عبداللہ بن حسن کا ذکر ان کی شہادت کے واقعہ کے بعد بیان کررہے ہیں اور ان کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اسی سال بصرہ میں نفسِ زکیہ کے بھائی ابراہیم نے بھی علَمِ خلافت بلند کیا، کوفہ کے لوگ بھی ان کے ساتھ ہوئے مؤرخین کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کو ابراہیم کی رفاقت پر علانیہ ابھارتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ ان کے ساتھ ہوکر حکومت کا مقابلہ کریں۔

مگر ابراہیم نے شکست کھائی، عباسی فرماں روا منصور نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بدلہ لینا چاہا، ان کو کوفہ سے بغداد طلب کیا، ارادہ تو قتل کا تھا مگر حالات دیکھتے ہوئے کھلے بندوں قتل سے خائف تھا، بہانہ کا متلاشی ہوا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بغداد گئے، منصور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھا،

آپ اُمرائے جور سے رابطہ پسند نہیں کرتے اور نہ ان کے وظائف قبول کرتے ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حکومت سے ایک درہم تک لینے میں سب سے محتاط تھے۔

خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے عہدۂ قضا قبول کرنے کو کہا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کیا، منصور نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اصرار کیا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ انکار ہی کرتے رہے، منصور نے جیل کی سزادی، کوڑے لگوائے مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ راضی نہ ہوئے، جیل میں بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی مشغولیت یعنی خدمت درس وافتا جاری رہی، جب منصور کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بدظنی بڑھتی گئی تو آخری خفیہ تدبیر یہ کی کہ بے خبری میں زہر دلوادیا، زہر نے اثر کیا بالآخر ۱۵۰ھ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بحالتِ سجدہ واصل بحق ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی، تمام شہر اُمنڈ آیا حسن بن عمّارہ قاضیِ شہر نے غسل دیا، چھ بار جنازہ کی نماز ہوئی، پہلی بار پچاس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، بیس دن تک دعا کے لیے قبر کے پاس آنے جانے والوں کی بھیڑ رہی، بغداد میں مقبرۂ خیزران آخری خوابگاہ بنی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی فطری ذہانت وفطانت، علمی قوت اور عملی واخلاقی کمالات کے ساتھ ساتھ نہایت عابد ومرتاض اور رقیق القلب تھے۔ خشیتِ الٰہی، عبرت پذیری، زہد وتقویٰ اور اِنابت الی اللہ میں ان کا خاص حصہ تھا، مستقل مزاج اور حق گو تھے، ذکر وعبادت میں ان کو بڑا مزہ آتا تھا، بڑے ذوق وشوق سے ادا کرتے تھے اس باب میں ان کی شہرت ضرب المثل تھی۔

مشہور محدث وناقد امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے: امام ابو حنیفہ کی تہجد اور شب بیداری کے واقعات اس کثرت سے بیان کئے گئے ہیں کہ وہ حدِّ تواتر کو پہنچے ہیں، شب بیداری اور اس کے قیام ہی کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو لوگ وَتَد (میخ) کہتے ہیں۔

مکی بن ابراہیم کہتے ہیں: امام صاحب کی ساری کدّو کاوِش کا رُخ قبر ہی کی جانب تھا؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ خزکی جو خاص قسم کا کپڑا تھا وسیع پیمانہ پر تجارت کرتے تھے۔ کارخانہ بھی تھا کوفہ میں دوکان بھی تھی سارے ملک میں مال کی فروخت اور درآمد برآمد کا سلسلہ جاری تھا لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ معاملہ کی سچائی میں مشہور تھے ٹال مٹول سے ان کو نفرت تھی، قرض داروں کو مہلت دینا؛ بلکہ معاف کردینا امام صاحب کا عام دستور تھا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امانت داری مثالی تھی، انتقال کے وقت ان کے پاس ۵ر کروڑ کی امانتیں تھیں پھر ایسی کہ بعینہ اپنی مُہر کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔

دولت کی فراوانی کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف تھی، خود فرماتے ہیں: ”میری ذاتی خوراک مہینے میں دو درھم سے زیادہ نہیں ہے کبھی ستو کبھی روٹی۔“ سہل بن مزاحم کا بیان ہے: ہم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے تو ان کے کمرے میں چٹائیوں کے سوا اور کچھ نہ پاتے۔

تجارت واکتساب سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد خلق اللہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا تھا، فرماتے ہیں: ”اگر مجھ کو اندیشہ نہ ہوتا کہ حکام وامراء کے سامنے مجھے ہاتھ پھیلانا پڑے گا تو اپنے پاس ایک درھم نہ رکھتا“۔

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے احباب اور ملنے والوں کے لیے روزینے مقرر کردیتے تھے۔ شیوخ

ومحدثین کے لیے تجارت کا ایک حصہ مخصوص تھا جس کا نفع سال کے سال ان کو پہنچا دیا جاتا تھا۔ معمول تھا کہ گھر والوں کے لیے کوئی چیز خرید فرماتے تو اس قدر محدثین اور علماء کے پاس بھجواتے، شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اس کی خود کفالت فرماتے، اتفاقیہ کوئی ملنے آتا تو حال پوچھتے، حاجت مند ہوتا تو نہایت فیاضی سے اس کی حاجت پوری فرماتے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ جمالِ صورت بھی دیا تھا۔ درمیانہ قد، خوش رُو، خوش لباس تھے، عطر کا استعمال بکثرت کرتے تھے۔ گفتگو کا طریقہ عمدہ اور لہجہ نہایت شیریں تھا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محاسن واخلاق کی ترجمانی ہارون الرشید کے سامنے اس طرح کی: ”جہاں تک میں جانتا ہوں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق وعادات یہ تھے کہ وہ نہایت پرہیز گار تھے، شبہات سے بچتے تھے، اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے، کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے، نہایت سخی اور فیاض تھے، کسی کے آگے حاجت نہ لے جاتے اہلِ دنیا سے احتراز تھا، دنیوی جاہ کو حقیر سمجھتے تھے غیبت سے بچتے تھے، جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے بہت بڑے عالم تھے اور مال کی طرح علم صرف کرنے میں بھی بے حد فیاض تھے“۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شبانہ روز کے معمولات عموماً یہ تھے کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے دور سے استفتے آئے ہوئے ہوتے ان کے جواب لکھتے، پھر تدوینِ فقہ کی مجلس منعقد ہوتی، بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا، گفتگو شروع ہوتی، مسائل کے جواب،

بحث مباحثے کے بعد قلمبند کر لیے جاتے، نماز ظہر پڑھ کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر آتے، گرمیوں میں ہمیشہ نمازِ ظہر کے بعد سو رہتے، نمازِ عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا باقی وقت لوگوں سے ملنے ملانے، بیماروں کی عیادت، ماتم پرسی اور غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا۔

مغرب بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشا تک رہتا نمازِ عشا پڑھ کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوتے، طویل قرأت کرتے، اکثر رات بھر نہ سوتے، جاڑوں میں مغرب بعد مسجد ہی میں سو رہتے، تقریباً دس بجے اٹھ کر نماز عشا پڑھتے پھر تمام رات تہجد میں گزار دیتے، کبھی کبھی دوکان پر بیٹھتے اور وہیں مشاغل انجام پاتے۔

جو چیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ ایجاد، جدّتِ طبع، دِقّتِ نظر، وسعتِ معلومات، غرض ان کے تمام کمالات کا آئینہ ہے وہ علم الفقہ ہے، جس کی تدوین میں انہوں نے اپنے تمام علمی کمالات ظاہر کر دیے اور اس کی اصل محرک کیا چیز تھی؟

مسلم بن سالم فقیہ کی زبانی سنیے: ”میں نے بڑے بڑے علماء سے ملاقات کیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے احترام کا جذبہ جتنا زیادہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں پایا اس کی نظیر کہیں نظر نہیں آئی۔“

علماء و محدثین کے اقوال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: کیا آپ نے ابو حنیفہ کو دیکھا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ہاں! ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے اگر وہ آپ سے کلام کرے اس ستون کے بارے میں تو اپنی دلیل و حجت سے اس کو سونے کا ہونا ثابت کر دے۔

یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا: ”اللہ پر جھوٹ مت باندھو! ہم نے ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی

رائے سے بہتر کوئی رائے نہیں سنی، اور ہم نے ان کے زیادہ تر اقوال کو اختیار کیا ہے۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہ تھے۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”لوگ فقہ میں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے محتاج ہیں۔“

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”فقہ اور اس کی باریکیوں میں امامت اس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہے اور یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی شک نہیں۔“

ليس يصح في الأذهان شيء　　إذا احتاج النهار إلىٰ دليل

علی بن عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”اگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم کو اپنے زمانے کے تمام لوگوں کے علم کے ساتھ تول دیا جائے تو ان کا پلڑا بھاری ہو گا۔“

حفص بن غیاث رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی گفتگو بال سے بھی زیادہ باریک ہے، اسے صرف جاہل ہی عیب لگاتا ہے۔“

جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”مغیرہ نے فرمایا: ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کرو، کیوں کہ اگر ابراہیم نخعی زندہ ہوتے تو وہ بھی ان کی صحبت اختیار کرتے۔“

عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے: ”اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو حنیفہ اور سفیان (ثوری) کے ذریعے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں عام لوگوں کی طرح ہی ہوتا۔“

سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا: ”آپ رحمۃ اللہ علیہ نے طلبِ علم میں مشغولیت اختیار کی اور اس میں کمال درجے کی محنت کی یہاں تک کہ وہ مرتبہ پایا جو کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ ایک دن آپ منصور کے پاس داخل ہوئے اور اس وقت عیسیٰ بن موسیٰ بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے منصور سے کہا: یہ آج دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے۔“

مکی بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں اور بخاری کی اکثر ثلاثیات انہی سے

ہیں) نے کہا: ”وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔“

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”میں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر حدیث کے فہم اور تفسیر جاننے والا کوئی نہیں دیکھا۔“

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

”میں نے حسن بن عمارۃ کو دیکھا کہ وہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سواری کی رکاب پکڑے ہوئے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: اللہ کی قسم! ہم نے کسی کو نہیں پایا جو فقہ میں آپ سے زیادہ بلیغ انداز میں بات کرے، نہ اتنے جامع اور تیز جواب دینے والا۔ بے شک آپ اپنے وقت میں اس علم میں سب سے بڑے ہیں، جن کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ لوگ جو کچھ آپ کے بارے میں کہتے ہیں وہ محض حسد کی بنا پر ہے۔“

امام ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ وہ کہا کرتے تھے:

”امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار، سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عابد تھے۔“

یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”میرے نزدیک فقہ، فقہِ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی ہے۔“

مِسعَر بن کدام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”میں نے ان کی رائے کو اس کی صحت کی وجہ سے اختیار کیا ہے، اگر تم اس سے زیادہ صحیح رائے لے آؤ تو میں اسے چھوڑ کر اس کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔“

فقہِ حنفی کے چار ستون:

جن صدہا طلبہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بہ حیثیتِ طالب علم استفادہ کیا اور جن کو فروعات کی تفریع اور ان کے جواب کی تخریج میں یدِ طولی حاصل تھا ان میں سب سے زیادہ مشہور یہ چار ہیں:

۱)امام زفر رحمۃ اللہ علیہ:

زُفَر بن ہُذیل بن قیس کوفی (ولادت ۱۱۰ھ- وفات ۱۵۸ھ) پہلے حدیث پڑھی پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر قیاس کے امام ہوئے، دنیوی کشمکش سے الگ ہو کر ساری زندگی تعلیم و تعلم میں گذار دی۔

۲)امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ:

ابو یوسف یعقوب بن براھیم انصاری (ولادت ۱۱۳ھ) پہلے علم حدیث کی تحصیل کی، ہشام بن عروہ وغیرہ سے حدیث سنی، مشہور محدث یحیٰ بن معین کا قول ہے کہ اہل الرائے میں ابو یوسف سب سے زیادہ کثیر الحدیث اور صحیح الروایت تھے۔

تحصیلِ حدیث کے بعد قاضی ابن ابی لیلٰی سے فقہ ابراہیمی پڑھی پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں بیٹھے اور اکابر تلامذہ ہو کر بہترین علمی مدد گار بنے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر کتابیں لکھیں مسائلِ ابو حنیفہ کو روئے زمین پر پھیلایا، مہدی کے زمانہ میں قاضی ہوئے اور ہارون رشید کے عہد میں پوری مملکتِ آلِ عباس کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے ۱۸۳ھ میں وفات پائی۔

فرماتے ہیں۔ ''امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتنے بابرکت تھے کہ ہمارے لیے دنیا و آخرت دونوں

کے برکات کی راہ کھول دی"۔

۳) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ:

محمد بن حسن بن فرقد شیبانی (ولادت ۱۳۲ھ) بچپن سے تحصیلِ علم میں لگ گئے پہلے حدیث پڑھی، پھر ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جب کہ وہ بغداد میں منصور کی قید میں تھے استفادۂ فقہ شروع کیا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہوگیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تکمیل کی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مدینہ جاکر موطا پڑھی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نہایت ذھین اور طبّاع تھے۔ تفریعِ مسائل میں انہیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہی کے زمانہ میں مرجع خلائق بن گئے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ تر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے قائم ہوا، انہیں کی کتابیں اس سلسلہ میں زیادہ مشہور ہوئیں۔

۱۸۹ھ میں وفات پائی، عہدِ ہارونی میں یہ بھی قاضی ہوئے، کتبِ فقہ میں امام ابو یوسف "الثانی" اور امام محمد "الثالث" کہلاتے ہیں، دونوں کو ملاکر "صاحبین" کہا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ "شیخین" کہلاتے ہیں تینوں کو ملاکر "ائمۂ ثلاثہ" کہتے ہیں۔

۴) امام حسن رحمۃ اللہ علیہ:

حسن بن زیاد لؤلؤی، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیلِ فقہ کی ابتداء کی اور صاحبینؒ سے تکمیل کی، فقہِ حنفی پر متعدّد کتابیں لکھیں، قیاس کے ماہر تھے، کچھ عرصہ قاضی رہے، ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا۔

فقہِ حنفی کے یہ وہ چار ائمہ ہیں جن سے یہ مذہب پھیلا، فقہِ حنفی اگر چہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی

طرف منسوب ہے مگر فی الحقیقت ان کی اور ان کے تلامذہ بالخصوص مندرجہ بالا چار ائمہ کی رایوں کا مجموعہ ہے اور سب پر فقہِ حنفی کا اطلاق ہوتا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر کوئی حنفی کسی مسئلہ میں امام ابو یوسف یا امام محمد یا کسی اور تلمیذِ امام ابو حنیفہ کی رائے کے موافق حکم دے تو یہ امام ابو حنیفہ کی رائے کے خلاف نہیں ہوگا۔ پھر آگے لکھتے ہیں "بلا شبہ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں کے اقوال مذہب ابی حنیفہ سے خارج نہیں ہیں۔ رسم المفتی میں ہے: حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگردوں نے جو قول بھی اختیار کیا ہے وہ امام صاحب ہی کی کسی نہ کسی روایت پر مبنی ہے۔

ائمۂ اربعہ اور فقہِ حنفی کے عمودِ اربعہ ایک نظر میں

نام	پیدائش	مسکن	وفات	مقامِ وفات	کل عمر
ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ	۸۰ھ	کوفہ	۱۵۰ھ	کوفہ	۸۰ر سال
مالک بن انسؒ	۹۳ھ	مدینہ منورہ	۱۷۹ھ	مدینہ منورہ	۸۶ر سال
ابویوسف یعقوب بن ابراہیم	۱۱۳ھ	کوفہ، بغداد	۱۸۳ھ	کوفہ، بغداد	۷۰ر سال
محمد بن حسن شیبانیؒ	۱۳۲ھ	کوفہ، عراق	۱۸۹ھ	واسط	۵۷ر سال
زفر بن ھذیل کوفی	۱۱۰ھ	کوفہ، بصرہ	۱۵۸ھ	کوفہ	۴۸ر سال
حسن بن زیاد لولوی	۲۰۴ھ			کوفہ	
ابوعبداللہ محمد بن ادریسؒ	۱۵۰ھ	آخری وطن مصر	۲۰۴ھ	غزہ، عسقلان	۵۴ر سال
ابوعبداللہ احمد بن محمد حنبلؒ	۱۶۴ھ	بغداد	۲۴۱ھ	بغداد	۷۷ر سال

فقہِ حنفی کا سلسلہ بصورتِ شجرہ

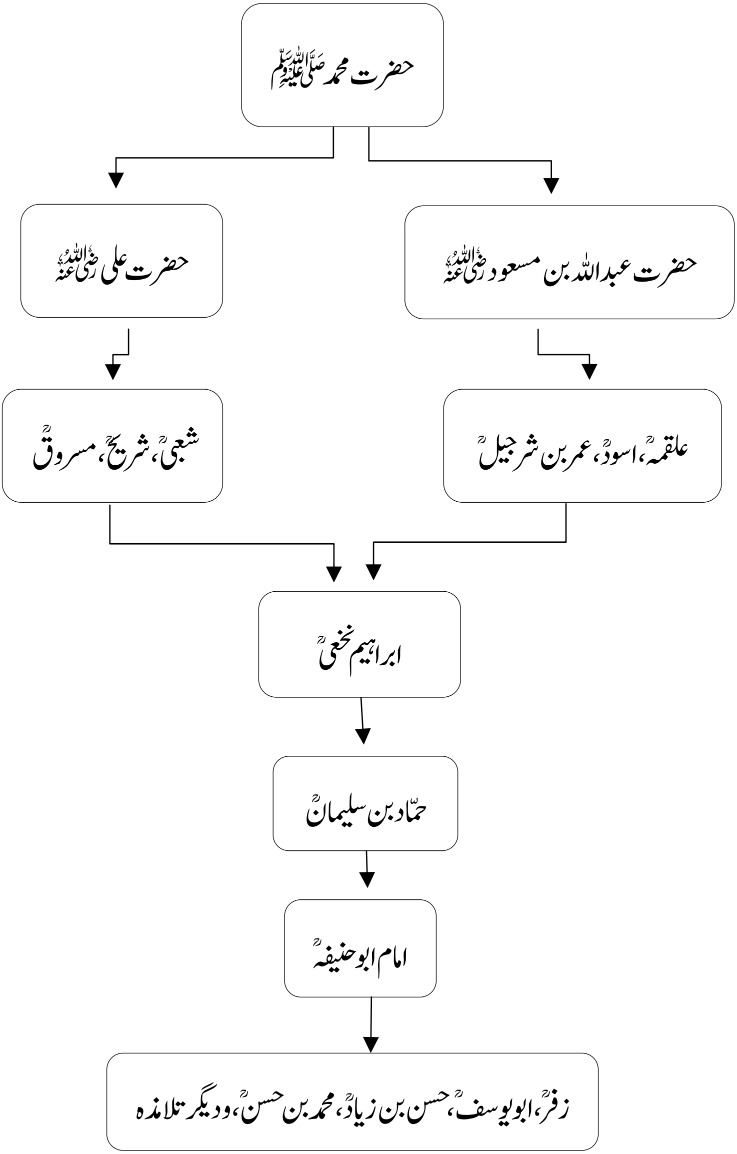

فقہ کے اَدوار و مراحل (مختصراً)

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر ضروری ہو گیا تھا کہ بغرضِ تحفظِ اسلام فقہ اور اصولِ فقہ کی باضابطہ تدوین کی جائے، پیدا شدہ مسائل کے ساتھ پیدا ہونے والے امکانی مسائل کی تنقیح، تحقیق کی جائے، اصول اور ضوابط متعیّن کئے جائیں۔

اللہ کی رحمت ہو امام الائمہ سراج الامۃ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر سب سے پہلے انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے تلامذہ کی جماعت کے ساتھ تدوینِ فقہ میں لگ گئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے علمِ فقہ کی تدوین کی احادیثِ نبویہ کے درمیان فقہ کی مستقل کتاب لکھی اس کی تبویب کی اس کی ابتدا طہارت سے کی پھر نماز پھر دوسرے عبادات پھر معاملات کے مسائل لکھے یہاں تک کہ فرائض پر کتاب ختم کی، اس بارے میں مالک نے ان کے بعد کام کیا اور ان کے بعد ابن جریج اور ہشام کا کام ہے۔

بہر حال فقہ کو فن کی شکل میں مدوّن کرنے والے سب سے پہلے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، البتہ فقہ کی تدوین مختلف مراحل میں انجام پائی ہے اور بتدریج اس نے ترقی کا سفر طے کیا ہے اس اعتبار سے چھ ادوار و مراحل علماء نے مقرر کیے ہیں۔

۱) عہدِ نبوی تا ۱۱ھ

۲) خلافتِ راشدہ ۱۱ھ تا ۴۰ھ

۳) اصاغرِ صحابہ اور اکابرِ تابعین کا عہد (۴۱ھ سے دوسری صدی ہجری کے اوائل تک)

۴) دوسری صدی ہجری کے بعد چوتھی صدی ہجری کے نصف تک

۵) چوتھی صدی ہجری کے نصف سے سقوطِ بغداد ۶۵۶ھ تک

۶) سقوط بغداد سے تیرھویں صدی ہجری تک پھر عصر حاضر تک

پہلا دور: عہدِ نبوی

عملی زندگی میں پیدا ہونے والے واقعات اور حوادث میں کسی ماہرِ شریعت کے دینی فیصلہ کا نام فتویٰ ہے، ایسا ماہر مجتہد فقیہ اور مفتی کہلاتا ہے، اسلام میں اصل فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے اس لیے اسی شخص کا فیصلہ مستند ہو سکتا ہے جس کے فیصلہ کی بنا کتاب اللہ اور سنّت نبوی پر ہو۔

عہدِ نبوی میں اس اہم خدمت کا تعلق خود سرکار نبوت ﷺ سے تھا، عہد نبوی میں احکامِ فقہیہ کا مدار کتاب وسنّت تھا، کیوں کہ یہ احکامِ الٰہی جاننے کا معصوم ویقینی راستہ ہے جب براہِ راست آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہو تو اجتہاد واستنباط کی بہت زیادہ ضرورت باقی نہیں رہتی البتہ آپ سے گاہے بگاہے اجتہاد کرنا بھی ثابت ہے۔

وفات نبوی سے پہلے صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت مشکاۃ نبوت سے فیض پا کر اپنے تجرِ علمی اور جودتِ کی بنا پر اس کام کے لیے باصلاحیت ہو چکی تھی، چنانچہ وفات سے پہلے خود حضور ﷺ نے فیصلوں کی اجازت بعض صحابہؓ کو دی اور اصولِ فیصلہ کی خود تعلیم بھی فرمادی۔ آپ ﷺ کے عہد میں بعض صحابہ نے بھی اجتہاد کیا۔

دوسرا مرحلہ: خلافت راشدہ

عہدِ نبوی کے بعد خلفاء راشدین اور دوسرے اہلِ افتاء صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مقدس

خدمت کو اپنے ذمہ لیا۔ یہ عہد ۱۱ھ سے شروع ہوا اور ۴۰ھ پر ختم ہوا۔

اس عہد میں احکامِ شرعیہ کے اخذ و استنباط کا سرچشمہ قرآن و حدیث کے علاوہ اجماع وقیاس تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کے نام خط لکھا تھا جس میں قرآن و سنّت کے بعد اجماع اور اس کے بعد اجتہاد سے کام لینے کی نصیحت تھی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ جن مسائل کے بارے میں قرآن و حدیث کی کوئی نص موجود نہ ہو ان میں اہم شخصیات کو جمع کیا جائے اور فیصلہ کیا جائے۔

چوں کہ غیر منصوص میں اجتہاد کے علاوہ چارہ نہ تھا اس لیے صحابہ میں اختلافِ رائے بھی ہوا۔ صحابہ کا مزاج یہ تھا کہ اختلافِ رائے کو مذموم نہ سمجھتے اور اس کا حق دیتے تھے۔

اس دور میں کسی بھی پیش آمد مسئلہ کے حل کے لیے اوّلاً قرآن و حدیث کو دیکھا جاتا، بصورت دیگر صحابہ کی متفقہ رائے پر نظر کی جاتی ورنہ اجتہاد کیا جاتا، اگر بعد میں روایت سامنے آتی تو اپنا قول واپس لے لیتے۔

لیکن اس دور میں صلاح و تقویٰ غالب تھا لوگ اپنی خواہشات کے بجائے شریعت کے پابند تھے اس لیے لوگوں کو آزادی تھی چاہے وہ امیر المومنین سے فتویٰ لے چاہے حضرت ابوہریرہ، حضرت معاذؓ وغیرہ و دیگر صحابہ سے، یعنی تقلید تھی تقلیدِ شخصی نہیں تھی۔ علامہ ابن الھمامؒ فرماتے ہیں: لوگ اس زمانہ میں کبھی کسی مجتہد سے فتویٰ پوچھتے کبھی کسی اور سے ایک ہی مجتہد سے فتویٰ پوچھنے کا التزام نہیں تھا۔ وہ مجتہدین صحابہ جن کے فتاویٰ محفوظ ہیں وہ ۱۴۹/ ہیں۔

تیسرا مرحلہ: اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین کا

یہ مراحلہ حضرت معاویہؓ کی امارت سے شروع ہوتا ہے اور بنواُمیّہ کی حکومت کے خاتمہ کے قریبی زمانہ تک کا احاطہ کرتا ہے۔

اس زمانہ میں بھی اجتہادواستنباط کا وہی نہج رہا جو صحابہ نے اختیار کیا تھا فقہ پر اقوال وکتابچہ تھے لیکن باقاعدہ مدون نہیں ہوئی تھی۔

البتہ اس زمانہ میں اسلام کافی پھیل چکا تھا تو اجتماعی اجتہاد کی جگہ انفرادی اجتہاد کا غلبہ تھا۔ دوسرے مختلف شہروں کے حالات، الگ الگ رواجات نئے کاروباری طریقے اور فکری وعملی رجحانات بھی مختلف تھے۔ اس اختلاف کا اثر مختلف شہروں میں بسنے والے فقہاء پر پڑا اور اختلاف رائے کی کثرت ہوئی۔

اس عہد میں اہل سنۃ والجماعہ میں دو مکتب فکر نمایاں ہوئے۔ ایک اصحاب الرائے اور دوسرے اصحاب الحدیث، ان میں دو بنیادی فرق تھا ایک یہ کہ اصحاب الحدیث کسی حدیث کو قبول اور رد کرنے میں محض سند کی تحقیق کو کافی سمجھتے تھے اور اصحاب الرائے اصول روایت کے ساتھ اصولِ درایت کو بھی ملحوظ رکھتے کہ وہ حدیث قرآن کے مضمون سے ہم آہنگ ہے یا اس سے معارض ہے دین کے مسلمہ اصول کے موافق ہے یا نہیں وغیرہ۔

دوسرا یہ کہ اصحاب الحدیث ان مسائل سے آگے نہیں بڑھتے تھے جو حدیث میں مذکور ہوں اور اصحاب الرائے نہ صرف یہ کہ جن مسائل میں نص موجود نہ ہوتی ان میں مصالح شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرتے، بلکہ جو مسائل ابھی وجود میں نہیں آئے لیکن ان کے واقع ہونے کا امکان ہے ان کے بارے میں پیشگی تیاری کے طور پر غور کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے، اسی کو ''فقہِ تقدیری'' کہتے ہیں۔

چوتھا مرحلہ: اوائل دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی

تدوینِ فقہ کا چوتھا مرحلہ جو عباسی دور کی ابتداء سے شروع ہو کر چوتھی صدی ہجری کے درمیان تک محیط ہے۔ یہ نہایت اہم دور ہے اور اسے نہ صرف فقہ اسلامی بلکہ تمام ہی اسلامی وعربی علوم وفنون کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔

اس عہد میں اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو چکی تھی، اسلامی دنیا کی تہذیب و تمدن میں بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی، سادہ اسلام کو دنیا کی متمدن اقوام کی تہذیب اور علوم سے سابقہ پڑ رہا تھا، نئے نئے حالات اور مسائل پیدا ہو رہے تھے خود مسلمانوں کے نظریہ اجتہاد اور اصولی وفروعی مسائل میں غیر منظم اختلاف روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا، مسلمانوں کی تعداد کئی کروڑ ہو چکی تھی، اس کے علاوہ فرقہ ضالہ کا بھی ظہور ہو چکا تھا اور خواہشات کی اتباع کی طرف میلان بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے پراگندہ اور بدلے ہوئے حالات میں امام ابو حنیفہؒ کو سب سے پہلے فقہ اسلامی کی تدوین کا خیال پیدا ہوا اور وہ اہلِ علم کی ایک جماعت کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوئے، اس دور میں اجتہاد عام تھا۔

اس دور میں صحابہ وتابعین کے فتاویٰ بھی ملے جلے جمع کئے گئے، امام ابو یوسفؒ وامام محمد کی کتاب الآثار، امام مالک کی موطا مالک اس دور میں لکھی گئی۔ اصولِ فقہ کی باضابطہ تدوین بھی اسی عہد میں ہوئی اور امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الرائی لکھی گئی، اس عہد میں فقہی اصطلاحات کا ظہور ہوا اور احکام فرض، واجب، سنّت، مباح، مستحب جیسی اصطلاحات نے رواج پایا۔

پچھلے ادوار کے مقابلے میں اس عہد میں اجتہاد واستنباط کی کثرت ہوئی، اس کے بنیادی دو سبب ہیں (۱) عباسی حکومت کا علمی ذوق۔ (۲) عالم اسلام کی وسعت، لہٰذا سوالات کی کثرت ہوئی اور اس نسبت سے فقہی اجتہادات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اس عہد میں بڑے بڑے بلند پایہ عالی ہمت اور اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے محیر العقول علماء فقہاء پیدا ہوئے، کیوں کہ اس زمانہ میں اس درجہ کے اہلِ علم کی ضرورت تھی، پھر ان میں بعض فقہاء فقہ میں مرجع بنے اور اہلِ علم کی ایک تعداد ان کے ساتھ ہو گئی اور انہوں نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مکاتب کو وجود بخشا اور شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیتیں میں ائمۂ اربعہ کی ہیں۔

لیکن فقہ کی باضابطہ تدوین کا شرف (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا) جس شخصیت کو حاصل ہوا وہ امام ابو حنیفہؒ کی ذات والا صفات ہے، اسی لیے امام شافعیؒ نے فرمایا من اراد الفقہ فھو عیال ابی حنیفۃ۔

اس کا اعتراف تمام ہی منصف مزاج علماء نے کیا ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں، ''امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کی تدوین کی اور اسے باب وار مرتب کیا، پھر موطا کی ترتیب میں امام مالک نے انہیں کی پیروی کی، امام ابو حنیفہؒ سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

علامہ ابن حجر مکی اور ان کے علاوہ بہت سے علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ امام صاحب نے دوسرے فقہاء کی طرح انفرادی طور پر اپنی آرا مرتب نہیں کی بلکہ حضرت عمرؓ کی طرح شورائی انداز اختیار کیا۔

علامہ موفق کا بیان گزر چکا ''امام ابو حنیفہؒ نے اپنا مذہب شورائی رکھا وہ شرکائے شوری کو چھوڑ کر تنہا اپنی رائے مسلط نہیں کرتے امام صاحب ایک ایک مسئلہ پیش کرتے، ان کے خیالات کا جائزہ لیتے اور ان کی بھی باتیں سنتے، اپنے خیالات پیش کرتے اور بعض اوقات

ایک ماہ یا اس سے زیادہ تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھتے یہاں تک کہ ایک قول متعیّن ہو جاتا۔

پانچواں مرحلہ: چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے سقوط بغداد تک ۶۵۶ھ

اس دور کو تکمیل فقہ و تقلید کا دور بھی کہتے ہیں۔ اس عہد میں شخصی تقلید کا رواج ہوا اور عام لوگ احکام میں ایک متعیّن مجتہد کی پیروی کرنے لگے۔ پہلے دور کے مخصوص ائمہ کی فقہ پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ کثرت سے فقہی مسائل پیدا ہوئے ان کی تخریج کی گئی، اس دور میں اجتہاد کو درجۂ تخریج تک منحصر کر دیا گیا۔ مخصوص مذہب کے مقلد اکابر ائمہ پیدا ہوئے۔

اس دور میں تقلیدِ شخصی کے عام ہونے کی ہونے کی تین بنیادی وجہ یہ ہے۔ (۱) بہت سے لوگ اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگے جو اس کے اہل نہیں تھے (۲) ائمہ مجتہدین کی سعی و محنت سے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ (۳) علمی انحطاط۔

اس عہد میں مقلد علماء نے اپنی فقہ کے مسائل کے دلائل تلاش و استنباط کیے۔ مختلف آراء کے درمیان میں ترجیح دی اور مجتہد کے اقوال کی توضیح و تشریح کی، اس طرح اس عہد میں متبوع ائمہ کے مذاہب منظم و موضح ہو گئے۔ اس دور کا اہم فقہائے احناف علامہ کرخی، علامہ ھندوانی، فقیہ ابو اللیث سمرقندی، علامہ جرجانی، علامہ قدوری، علامہ سرخسی، صاحبِ ہدایہ، صاحبِ بدائع وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چھٹا مرحلہ: سقوط بغداد تا اختتام تیرھوی صدی

اس دور میں اجتہاد کا سلسلہ تقریبًا بند ہو کر رہ گیا، عوام و خواص سب مخصوص مذاہب کے مقلد ہو گئے ہر مسئلہ میں سابقہ ائمہ کی آراء کی تلاش ہونے لگی یہ دور تقلید محض کا دور

کہلاتا ہے، تقلید محض ساتویں صدی کے بعد سے شروع ہوئی اور آج تک قائم ہے۔

یہ عہد بنیادی طور پر پانچویں مرحلہ کے ہی مماثل ہے، اس دور میں مختلف مسلکوں کے اہلِ علم نے اپنے فقہی مذہب کی خدمت کی، مختلف مذاہب سے متعلق فنون اور ان کی شرحیں، حواشی لکھے گے۔ اور فتاویٰ مرتب ہوئے، بہت سی گراں قدر تالیفات بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔

اس دور کے اہم علماء: صاحبِ کنز علامہ نسفی، علامہ زیلعی، علامہ بن الھمام، علامہ عینی، علامہ ابن نجیم، حافظ قطلوبغا رحھم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

عہدِ جدید اور فقہِ اسلامی

فقہِ اسلامی میں جدید دور کا آغاز ۱۳ / تیرھوی صدی کے اواخر کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب خلافت عثمانیہ کے حکم پر مجلہ: محلۃ الاحکام العدلیۃ کی ترتیب عمل میں آئی اس عہد میں فقہ اسلامی کی خدمت کا ایک رجحان پیدا ہوا۔

چنانچہ مسلکی تعصب جو بہت شدت اختیار کر گیا تھا اور فقہی مسائل، مناظرہ، ومجادلہ کا موضوع بن چکے تھے اس میں بہتری آئی، اہلِ علم مختلف ائمہ کی آراء کو پورے احترام اور انصاف کے ساتھ ذکر کرنے لگے، نیز سترھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے جس قدر نئے مسائل پیش آئے تصور نہیں کیا جاسکتا، اربابِ افتاء کی توجہ ان کی جانب مبذول ہوئی۔

(بحوالہ: فقہِ اسلامی، تدوین وتعارف اور تاریخِ فقہِ اسلامی)

علمِ فقہ کی فضیلت، اہمیت اور ہمہ گیریت

فقہ اسلامی کی اہمیت اور ہمہ گیریت:

اسلامی علوم میں ''فقہِ اسلامی'' ایک ایسا جامع علم ہے جس نے اسلام کے بنیادی سرچشمے یعنی قرآن اور حدیث کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے کیوں کہ فقہ اسلامی کی عمارت انہی دونوں بنیادوں پر قائم ہے، قرآن وحدیث کے بغیر فقہ کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، فقہ اسلامی انسان کی عملی زندگی اور اس کے روزمرہ معاملات کا دستور العمل ہے، یہ قرآن وحدیث کے احکام کی درجہ بندی کرتی ہے اور ان احکام پر عمل کے لیے تیار نمونے فراہم کرتی ہے۔ فقہ اسلامی ہی سے حق وناحق کی پہچان اور صحیح وغلط کی تمیز آتی ہے اور اسی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے اور کس قسم کی محنتیں اس کے نزدیک اکارت چلی جائیں گی۔

فقہِ اسلامی کی شعبہ جات:

فقہ دراصل انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور درج ذیل شعبائے حیات کی بابت اس فن کے ذریعہ رہنمائی ملتی ہے۔

عبادت: یعنی وہ احکام جو خدا اور بندہ کے براہ راست تعلق پر مبنی ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، اعتکاف، نذر عبادات میں شامل ہیں اور عبادات خالصۃً اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی پر موقوف ہیں اگر شریعت کی راہنمائی نہ ہوتی تو انسان اپنی عقل سے اس کو دریافت نہیں کرپاتا۔

احوالِ شخصیہ: یعنی دو آدمیوں کے درمیان غیر مالی بنیاد پر تعلقات سے متعلق احکام، اسی

میں نکاح وطلاق، فسخ وتفریق، عدت وثبوت نسب، نفقہ وحضانت، ولایت، میراث، وصیت وغیرہ احکام آجاتے ہیں، قدیم فقہا اس کے لیے "مناکجات" کا لفظ استعمال کرتے تھے، موجودہ دور میں اس کو "احوال شخصیہ"، اردو زبان میں "عائلی قانون" اور انگریزی میں Personallow کہاجاتا ہے۔

معاملات: یعنی دواشخاص کے درمیان مالی معاہدہ پر مبنی تعلقات، اس میں خرید وفروخت، شرکت، رہن وکفالت، ہبہ، عاریت، اجارہ وغیرہ قوانین شامل ہیں، آج کل اسے "تجارتی قوانین" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مرافعات: مرافعات سے مراد عدالتی قوانین ہیں، یعنی قاضی کا تقرر، شہادت ووکالت کے احکام، مقدمات کو ثابت کرنے کا طریقہ وغیرہ۔

عقوبات: جرم وسزا سے متعلق قوانین، اس میں شرعی حدود، قتل وجنایت کی سزااور جن جرائم کے بارے میں کوئی سزا متعیّن نہیں کی گئی ہے، ان کی بابت سزا کا تعین جسے فقہ کی اصطلاح میں تعزیر کہتے ہیں، شامل ہیں۔

اس تشریح سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فقہ اسلامی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور کس طرح اس نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے اندر سمولیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی سے لے کر خلافت عثمانیہ کے سقوط تک فقہ اسلامی نے ایشاء، افریقہ اور یورپ کے قابل لحاظ حصہ پر فرماروائی کی ہے، اگر فقہ اسلامی میں ہمہ جہت رہنمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی تو ہرگز وہ یہ مقام حاصل نہیں کرپاتی۔

اہلِ فہم اور دانشوروں کے یہاں یہ بات معروف ہے کہ علمِ فقہ اہم ترین علوم میں سے

ہے اور عوام وخواص کو نفع رسانی میں عام تر اور اکمل واتم ہے اس لیے کہ یہ وہ قانون ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنے عمل کو پرکھتا ہے کہ حلال ہے یا حرام؟ صحیح ہے یا فاسد؟ اور مسلمان اپنے معاملات وتصرفات میں حلال وحرام اور صحیح وفاسد جاننے کے حریص ہیں۔ برابر ہے ان کا تعلق اللہ سے ہو یا بندوں سے، بندہ رشتہ دار ہو یا رشتہ دار نہ ہو، دوست ہو یا دشمن ہو، حاکم ہو یا رعایا ہو مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو۔ اور سوائے علمِ فقہ کے ان احکام کی معرفت کی کوئی دوسری راہ نہیں ہے وہ علمِ فقہ جس میں بندے کے افعال کے متعلق اللہ بزرگ وبرتر کے حکم کے بارے میں بحث کی جاتی ہے کہ کسی فعل کے طلب کا حکم ہے یا دو فعل کے درمیان اختیار کا حکم ہے۔ برابر ہے کہ طلب کسی کام کے کرنیکی ہو یا کسی کام سے رکنے کی طلب ہو، پس علمِ فقہ پر خاص توجہ لازم ہے تاکہ علمِ فقہ کی وجہ سے بلند درجہ حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةٗۚ فَلَوۡلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرۡقَةٖ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٞ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي ٱلدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوۡمَهُمۡ إِذَا رَجَعُوٓاْ إِلَيۡهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَحۡذَرُونَ ١٢٢﴾ [التوبة:١٢٢]

ترجمہ: ”اور مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ (ہمیشہ) سب کے سب (جہاد کے لیے) نکل کھڑے ہوں لہٰذا ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ (جہاد کے لیے) نکلا کرے تاکہ (جو لوگ جہاد میں نہ گئے ہوں) وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے محنت کریں اور جب ان کی قوم کے لوگ (جو جہاد میں گئے ہیں) ان کے پاس واپس آئیں تو یہ اُن کو متنبہ کریں تاکہ وہ (گناہوں سے) بچ کر رہیں۔

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾﴾ [الأنعام:٩٨]

ترجمہ: ہم نے ساری نشانیاں ایک ایک کر کے کھول دی ہیں (مگر) ان لوگوں کے لیے جو سمجھ سے کام لیں۔

علمِ فقہ کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے خود دین میں تفقہ حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذر چکا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر چاہتا ہے اسے تفقہ سے سرفراز کرتا ہے یعنی دین کا فہم عطا فرماتے ہیں۔ امام محمدؒ کو بعد از وفات کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ امام محمدؒ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: محمد! اگر مجھے تیرے ساتھ خیر منظور نہ ہوتی میں تجھے اپنا علم نہ دیتا۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سے تمام لوگوں پر علماء کی فضیلت اور تمام علوم سے تفقہ فی الدین کا افضل ہونا ظاہر ہے۔ اسی لیے سلف صالحین کے یہاں حفظ حدیث کے مقابلہ تفقہ یعنی فہمِ حدیث کی اہمیت زیادہ تھی اور وہ فقہاء کے مرتبہ شناس تھے۔ امام ترمذی ایک حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وكذٰلك قال الفقهاء هم أعلم بمعاني الحديث.

ترجمہ: اسی طرح فقہاء نے کہا ہے وہی حدیث کے معانی و مفہوم کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

سلیمان بن مہران اعمش جیسے محدث نے ایک موقع پر فرمایا کہ اے جماعتِ فقہا! تم طبیب ہو اور ہم محض دوا فروش "يا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة" اس

لیے محدثین فقیہ راویوں کی روایت کو قابل ترجیح سمجھتے تھے، امام وکیعؒ کہتے تھے کہ جس حدیث کو فقہاء نقل کرتے ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کے راوی صرف محدث ہوں: حديث يتداوّله الفقهاء خير من أن يتداوّله الشيوخ.اسی لیے حافظ ابن حجرؒ کہا کرتے تھے کہ حلال وحرام کا علمِ فقہاء سے حاصل کرنا چاہیے: فإنَّ علمَ الحلال والحرام إنَّما يتلقى من الفقهاء. علامہ ابنِ تیمیہؒ جو فقہ وحدیث دونوں کے رمز شناس ہیں، امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں: ”حدیث میں تفقہ میرے نزدیک حفظِ حدیث سے زیادہ محبوب ہے“۔

علی بن مدینی فرماتے ہیں: متونِ احادیث میں تفقہ پیدا کرنا اور راویوں کے احوال کو جاننا سب سے اشرف علم ہے۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے بعد اسلام کا مدار فقہ پر ہے: ”وبعد از قرآن وحدیث مدار اسلام بر فقہ است“۔

افسوس کہ بہت سے لوگوں نے اتنے عظیم الشان فن کے بارے میں قدرِ ناشناسی کا ثبوت دیا ہے اور علمِ فقہ میں اشتغال کو معیوب سمجھا ہے۔ ان کی ناسمجھی پر سوائے افسوس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں کے لیے امام ابوالحسن منصور بن اسماعیل شافعیؒ کا شعر کافی ہے جس کو علامہ سبکیؒ نے نقل کیا ہے:

عاب التفقه قوم لاعقول لهم   وماعليه إذا عابوه من ضرر

ما أضرّ شمس الضحىٰ   أن لايرى ضوء ها من ليس

(فقہِ اسلامی تدوین وتعارف)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے روایت کیا گیا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرماتے ہیں اور امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کیا ہے

کہ دین کی سمجھ رکھنے والا ایک شخص شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے کم تر پر، اور یہ تمام تر فضیلت اس وجہ سے ہے کہ علم کا نفع متعدّی اور عبادت کا نفع (عابد تک) محدود و منحصر ہے، اور (مذکورہ فضیلت) اس وجہ سے ہے کہ علم یا تو فرض عین ہے یا فرض کفایہ اور فرائض سے زائد جو عبادتیں ہیں وہ نفل ہی ہوا کرتی ہیں اور عابد بسا اوقات مقلد ہوتا ہے اور عالم جانچ پڑتال کرنے والا (ادلہ) کو پرکھنے والا اور محقق ہوتا ہے لہٰذا دونوں کسی صورت میں برابر نہیں ہوسکتے۔ (۲)

۲　نوٹ: یہاں عالم سے مراد وہ شخص نہیں جو عمل سے بالکل خالی ہو اور نہ ہی عابد سے وہ شخص مراد ہے جو علم سے بالکل خالی ہو بلکہ عالم سے مراد وہ شخص ہے جس کا مشغلہ فرائض اور سننِ مؤکدہ کے اوقات کے علاوہ اپنا وقت زیادہ تر تعلیم، تدریس، تصنیف اور علم کے پھیلانے اور کتاب اللہ کے معانی میں تفکر کرنے میں صرف کرتا ہو اور عبادت میں سے فرائض، واجبات اور سنن موکدہ پر اکتفاء کرتا ہو، اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جو عبادت کی صحت کے لیے ضروری علم کے حصول کے بعد عبادت ہی میں مشغول رہے یعنی اس کی عبادت اس کے علم پر غالب رہے۔

لہٰذا کوئی یہ گمان نہ کرے کہ عالم عبادت سے مستغنی ہے یا عابد علم سے مستغنی ہے بلکہ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے، بے عمل علم بھی باعثِ عذاب ہے اور بے علم عمل بھی فاسد اور لایعنی ہے جب تک علم و عمل دونوں ساتھ نہیں ہوں گے تو یہ فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے برعکس عذاب کا اندیشہ ہے۔

اور فقاہت سے مراد دین اسلام کی سمجھ بوجھ خواہ وہ جہاں بھی ہو جس شعبہ میں ہو۔ ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ خود ابلیس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس رات کے وقت آیا اور فضا کو رنگ برنگے قمقموں سے روشن کر کے کہا کہ میں فرشتہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے کہ عبدالقادرؒ نے بہت عبادت کی ہے اور اب وہ معاف ہے اسے مزید عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ عبدالقادرؒ نے جواب دیا کہ جاؤ مردود شیطان اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو موت تک عبادت کا پابند بنایا تو میں کون ہوں جو معاف ہو گیا ابلیس نے کہا کہ ابھی چالیس پیروں کو میں نے اسی طرح سے گمراہ کیا ہے مگر آپ کے پاس بڑا علم تھا علم نے بچا لیا۔

شیخ نے کہا کہ جاؤ مردود! علم سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے بچ گیا ہوں۔ شیخ سعدیؒ نے سچ فرمایا:

(جاری)

قال رسول اللہ رسول اللہ ﷺ من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین.(بخاری)
نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کا فہم اور فقاہت عطا فرماتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے صحابہ دین سیکھنے اور دین کی سمجھ حاصل کرنے پر برابر جمے رہے اور اسی وجہ سے وہ جہاں والوں کے پیشوا بن گئے، حتی کہ ان کے بارے میں کہا گیا صحابہؓ ستاروں کی طرح ہے تم ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو راہِ حق پا جاؤ گے چنانچہ صحابہؓ نے احادیث وآثار کے وہ موتی جو رسول اللہ ﷺ نے پھیلاتے تھے ان کو محفوظ کیا اور اپنے بعد میں آنے والے عمدہ لوگوں کے لیے فائدہ دینے والے قواعد مقرر کیے۔

تاریخِ تدوینِ فقہ

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں علمِ فقہ:

رسول اللہ ﷺ کے بابرکت زمانے میں علمِ فقہ مدوّن نہیں تھا، اس وقت احکامِ شریعہ میں ایسی بحثیں بھی نہیں تھیں، جیسی آج فقہاء کرتے ہیں۔ فقہاء اپنی انتہائی کاوش کرتے ہیں کہ ہر بات دوسری بات سے دلیل کے ساتھ ممتاز ہو جاتی ہے، وہ فرضی احتمالات قائم کرتے ہیں

صاحب دلے بمدرسہ آمد زخانقاہ — بشکست مہ عہد صحبت اہل طریق
گفتم میان عابد وعالم چہ فرق بود — کہ تو کردی اختیار ازاں ایں فریق را
گفت آں گلیم خویش بروں می بروز — وایں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

ایک عارف خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ آیا اور تصوف کے قدیم طور وطریق کو اس نے توڑ دیا میں نے ان سے پوچھا کہ عالم اور عابد میں کیا فرق تھا کہ تم نے صوفیوں کو چھوڑ کر علماء کی رفاقت کو اختیار کیا ہے اس نے کہا کہ صوفی لوگ سمندری موجوں میں صرف اپنی چادر بچاتے ہیں اور علماء محنت کر کے ڈوبنے والے کو بچاتے ہیں۔

اور ان مفروضہ صورتوں پر کلام کرتے ہیں، فقہاء جو امور تحدید و تعریف کے قابل ہوتے ہیں ان کی حدود و تعریفات بیان کرتے ہیں اور جو امور حصر کے لائق ہوتے ہیں ان کو منحصر کرتے ہیں اور ایسے ہی ان کے اور کام ہیں۔

مگر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس وقت کا حال یہ تھا کہ صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم آپ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور وہ بھی اسی طرح وضو کرتے تھے، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کے سامنے وضو کی تفصیلات نہیں بیان فرماتے تھے کہ وضو میں یہ امر رکن ہے اور یہ بات مستحب، اسی طرح آپ نماز پڑھتے تھے اور صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم جس طرح آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔ آپ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم نے حج فرمایا تو صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم نے اس کو بغور دیکھا اور خود بھی ویسا ہی کیا جیسا آپ نے کیا۔ بس یہی آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عمومی حال تھا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ نہیں بیان کیا کہ وضو میں فرائض چھ ہیں یا چار؟ اور نہ یہ احتمال فرض کیا کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص موالات کے بغیر وضو کرے پس کیا اس کی وضو درست ہوگی یا نہیں؟ اس قسم کی جزئیات دور نبوی میں زیر بحث نہیں آئی تھیں، الا ماشاء اللہ کوئی خاص جزئی بیان کی ہو، اور صحابۂ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم اس قسم کی باتیں دریافت بھی نہیں کیا کرتے تھے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہ یہی عادت کریمہ تھی، پس ہر صحابی نے آپ کی عبادت، فتاوی اور قضایا میں سے، جتنا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسان کیا۔ دیکھا، سنا، یاد کیا اور سمجھا اور مقارن قرائن کے ذریعہ ہر بات کی وجہ بھی سمجھی، چنانچہ انہوں نے بعض باتوں کو اباحت پر بعض کو استحباب پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا، اور یہ فیصلے صحابہؓ نے ایسے قرائن کی

بنیاد پر کئے تھے جو ان کے نزدیک کافی وافی تھے اُن حضرات کے نزدیک اہم چیز دل کی تسکین اور قلب کا اطمینان تھا، وہ استدلال کے اصولی اور منطقی طریقوں کو نہیں اپناتے تھے، ان کے بغیر ہی مقصد کلام کو سمجھ لیتے تھے جیسے دیہاتی استدلال کے بغیر ہی آپس کے کلام کا مقصود سمجھ لیتے ہیں اور ان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، وہ ایک دوسرے کی مراد یا تو کلام کی صراحت سے یا اشارہ سے یا مفہوم مخالف سے سمجھ لیتے ہیں اور ان کو شعور بھی ہوتا اور سکون قلبی حاصل ہو جاتا ہے لوگوں کی یہی حالت رہی اور آنحضرت ﷺ کا بابرکت زمانہ بیت گیا۔

پھر جب صحابہ رضی اللہ عنہم خلافت فاروقی کے آخری زمانے میں اور خلافتِ عثمانی میں ملک کے اطراف میں پھیل گئے اور ہر صحابی اپنی جگہ مقتدی اور دین کا پیشوا بن گیا اور تمدّنی ترقی اور نظامِ حکومت میں وسعت کے نتیجے میں واقعات کی کثرت ہوئی اور طرح طرح کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے وہ مسائل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیے، چوں کہ عہدِ نبوی میں اسلام کا دائرہ عرب تک محدود تھا، عرب کی معاشرت سادہ تھی، ضرورتیں محدود تھیں مسائل و وسائل مختصر تھے اور عہدِ صحابہ میں یہ صورتِ حال نہیں تھی، اسلام کی حدود جب بہت بڑھ گئی، قیصر و کسری کی حکومتیں اسلام کے زیرِ نگیں ہوگئیں تو اسلام کو نئے تمدن، نئی تہذیب اور معاشرتوں سے سابقہ پڑا، وسائل اور مسائل کی نئی نئی قسمیں پیدا ہوگئیں تو سوالات لوگوں نے کیے۔ ہر صحابی نے ان روایات کی روشنی میں جو اس نے محفوظ کی تھیں اور نصوص سے جو کچھ اس نے سمجھا تھا اس کے مطابق جواب دیا اور اگر اس نے اپنے محفوظات اور مستنبطات میں کوئی بات جواب کے قابل نہ پائی تو اجتہاد سے کام لیا اور اس علت کو معلوم کیا جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصوص و مصرح احکام میں حکم کا مدار رکھا تھا، اور

جہاں اس نے وہ علت پائی حکم کو عام کیا اور اس امر میں نہایت کوشش کی کہ ان کا اجتہاد رسول اللہ ﷺ کی غرض کے موافق ہو جائے۔

اور ان سے اسی طرح تابعین نے دین اخذ کیا۔ ہر ایک نے جو اس کے لیے آسان ہوا، محفوظ کیا۔ اس نے روایات مرفوعہ اور صحابہ کے مختلف مذاہب سے ان کو سمجھا اور ان مختلف روایات کو جمع کیا، پھر ان میں سے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور بعض اقوال اگرچہ وہ کبار صحابہ سے منقول تھے، تابعین کی نظر میں کمزور پڑ گئے کہ انہوں نے عام طور پر اس کو ترجیح دی جو اپنے صحابی استاذ سے حاصل کیا یا اپنے شہر کے صحابی سے اخذ کیا۔ جیسے جنبی کے تیمم کے سلسلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت مسعودؓ کی رائے تابعین کے زمانہ میں اس وقت کمزور پڑ گئی جب حضرت عمارؓ اور حضرت عمرانؓ کی روایتیں مشہور ہوئیں پس اس وقت علماء تابعین میں ہر بڑے عالم کا ایک مستقل مسلک وجود میں آیا۔

تخریجِ مسائل میں اختلاف اور اس کے اسباب:

وفاتِ نبوی کے بعد عہدِ صحابہ میں جب اسلامی فتوحات کو وسعت ہونے لگی اور ان کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو اکثر ایسے واقعات پیش آئے جن میں اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑ گئی اور قرآن و حدیث کے اجمالی احکام کی تفصیل کی طرف اہلِ علم صحابہؓ کو متوجہ ہونا پڑا، مثلاً کسی نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا تو یہ بحث پیش آئی کہ نماز ہوئی یا نہیں؟

اس بحث کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے سب کو فرض کہہ دیا جاتا، اس لیے صحابہؓ کو تفریق کرنا پڑی کہ نماز کے یہ افعال فرض و لازم ہیں جن کا ترک نماز کو باطل کر دیتا ہے یہ افعال واجب ہیں جن کا ترک موجب کراہت ہے اور یہ امور مستحب ہیں جن کا ترک موجبِ خلل نہیں وغیرہ وغیرہ۔

تفرقہ کے لیے جو اصول قرار دیئے جاسکتے تھے ان میں تمام صحابہؓ کا اتفاق ناممکن تھا اس لیے مسائل میں اختلاف پیدا ہوگئے اور صحابہ کی رائیں مختلف ہوگئیں۔ بہت سے ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا عہدِ نبوی میں پتہ اور نشان ہی نہیں تھا، ایسی حالت میں اہلِ علم کو استنباط، حمل النظیر علی النظیر اور قیاس سے کام لینا پڑا ان میں بھی اصول یکساں نہ تھے، اس لیے اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہوا۔

بعض مسائل میں اہلِ علم صحابہ رضی اللہ عنہم کا منصوص علم بھی مختلف تھا کیوں کہ عہدِ نبوی میں دین کی تکمیل رفتہ رفتہ ہوئی، احکام میں حسبِ موقع تغیر و تبدل بھی ہوا اور تمام صحابہ کو ہر امر کا علم ہونا مشکل تھا کیوں کہ ہر وقت سب ہی موجود نہیں رہتے تھے جنہوں نے جیسا سنا اور دیکھا اس کو معمول بہ بنالیا اس وجہ سے بھی اختلاف ناگزیر تھا۔

عہدِ صحابہ و تابعین میں مسائل کے اندر اختلافِ آراء کے اسباب حسبِ ذیل یہ تین امور استقراء سے معلوم ہوتے ہیں:

۱. قرآن و حدیث کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں اختلاف۔
۲. جواب مسئلہ میں صحابہ کے منصوص علم میں اختلاف۔
۳. طریقِ استنباط میں اختلافِ مسلک۔

الغرض انہی اختلافات کے ساتھ عہدِ خلافت راشدہ اور اس کے بعد اہلِ افتاء صحابہ اور ان کے تلامذہ (تابعین) مختلف فوجی چھاونیوں میں رہے پھر مختلف اسلامی شہروں اور نو آبادیوں میں آباد ہوگئے اور لوگوں کو مسائل دین بتانے لگے۔ ابتدا میں اختلاف خفیف تھا، رفتہ رفتہ اختلاف کی حیثیت قوی بلکہ قوی تر ہوگئی اور تدوینِ فقہ کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

ضرورتِ تدوینِ فقہ:

حضرت شیخین سیدنا ابوبکر و سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کے عہدِ خلافت میں تمام مسلمان متحد تھے اختلافات نہایت جزئی تھے جس کی بنیاد قوی نہیں تھی، سیدنا عثمانؓ کے آخری عہدِ خلافت میں سیاسی فتنے شروع ہوئے، سیدنا علیؓ کے عہدِ خلافت میں اس فتنے نے زبردست خونریزی کی شکل اختیار کی۔ خارجیوں نے سر اٹھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد ہی مسلمانوں میں سے خارجی اور شیعہ دو مستقل جماعتین علاحدہ بن گئیں۔ جن کا مذہبی نظریہ بالکل مختلف تھا، اس کے علاوہ اسلام زمین کے مختلف خطوں میں پھیل چکا تھا قیصر و کسری کی حکومتیں اسلام کے زیرِ نگیں ہوگئیں، یورپ میں اندلس تک، افریقہ میں مصر اور شمالی افریقہ تک اور ایشیاء میں ایشیائی ترکستان اور سندھ تک اسلام پھیل گیا تو نت نئے مسائل درپیش آئے اور مسائل و وسائل کے بڑھ جانے سے نئے نئے مسائل فقہیہ پیش آنے لگے تو اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ایک مرتب اور مدون ایسا فقہ، قانون اسلامی ہونا چاہئے جو علم کے طلب گاروں کے لیے جس وقت بھی وہ اپنی زندگی میں احکام فقہیہ کی معرفت کے حاجت مند ہوں ماویٰ و مرجع بنے چاہے فقہی احکام فرض و سنّت ہو یا واجب و مباح۔

چنانچہ تابعین کے آخری عہد میں علمائے حق کی ایک جماعت نے کتاب و سنّت کو سامنے رکھ کر اس کے مقرر کردہ قوانین اور حدود کے مطابق ایک ایسا ضابطۂ حیات مرتب کرنا چاہا جو ہر حال میں مفید، ہر طرح مکمل اور ہر جگہ قابل عمل ہو اس طرح تابعین کے عہدِ آخر میں ایک نئے علم کی تدوین شروع ہوئی جو مکمل ہونے پر "علم الفقہ" کہلائی۔

اُس دور میں عام علماءِ اسلام میں دو جماعتیں ہوگئیں ایک محدثین کی جماعت تھی جو

صرف ظاہری حدیث پر عمل ضروری جانتی تھی، رائے اور قیاس سے مسائل پر غور وفکر ان کے نزدیک مذموم تھا چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ اورامام زہریؒ کے زمانے میں اور امام مالک اور حضرت سفیان ثوریؒ کے زمانے میں اور اس کے بعد علماء کی ایک جماعت ایسی تھی جو رائے کے ذریعہ مسائل میں غور و خوض کرنے کو ناپسند کرتی تھی اور نصوص سے استنباط کرکے فتویٰ دینے سے ڈرتی تھی، ہاں شدید ضرورت پیش آئے اور استنباط کے بغیر چارہ ہی نہ رہے تو پھر وہ اجتہاد کرتے تھے ان حضرات کی تمام تر توجہ روایت حدیث کی طرف تھی۔

دوسری جماعت اہل الرائے کی تھی جو قرآن وحدیث کے ساتھ درایت پر عمل ضروری جانتی تھی اور علل و اسباب کے ماتحت تفریعِ مسائلِ متوقعہ کی طرف متوجہ تھی، چنانچہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: امام مالک اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کے زمانے میں اور ان کے بعد محدثین کے بالمقابل کچھ حضرات ایسے تھے جو مسائل کو ناپسند نہیں کرتے تھے اور فتوی دینے سے ڈرتے نہیں تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ فقہ پر دین کی بنیاد ہے، اس لیے اس کی اشاعت ضروری ہے۔ اور یہ حضرات حدیث روایت کرنے سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بات منسوب کرنے سے ڈرتے تھے۔

اہلِ حجاز اکثر اہل الحدیث (محدثین) تھے اور اہلِ عراق اکثر اہل الرائے تھے، حجازیوں میں امام مالکؒ کے استاد ربیعۃ الرائے نے زیادہ شہرت حاصل کی اور عراقیوں میں ابراہیم نخعی اور ان کے شاگرد حمّاد بن سلمان (استاذ امام ابوحنیفہ) زیادہ مشہور ہوئے۔

نوٹ: اہل الحدیث کو حجازی مکتب فکر اور اہل الرائے کو عراقی مکتب فکر بھی کہا جاتا ہے۔

تدوینِ فقہ کی طرف حاجت شدید تر اور مدون اوّل:

دوسری صدی کے شروع میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کے فروعی اختلاف میں نزاع رونما ہوا، کثرت احادیث کی وجہ سے احادیثِ مختلفہ میں ترجیح کی نوعیت میں اختلاف ہوا، قیاس، رائے اور استحسان سے استخراجِ مسائل کے جواز میں اختلاف اٹھا، امر ونہی کے صیغوں سے احکام کی کیفیت اور حیثیت میں اختلاف ہوا، الغرض دوسری صدی کا ربعِ اوّل وہ زمانہ تھا کہ مسائل اور ان کے اصول دونوں میں اہلِ علم مختلف تھے، امراء اور حکام اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر قضاۃ سے اپنی مرضی کے مطابق جبراً غلط فیصلے کرا لیتے تھے۔

عام مسلمان قضاۃ کے مختلف فیصلوں کی وجہ سے سخت پریشان تھے، ان کے سامنے مسائل کی مدون شکل بھی نہیں تھی، تمدنی مسائل کی وسعت الگ تدوین قوانینِ احکام کی متقاضی تھی، اس لیے بغرضِ تحفظِ اسلام سخت ضرورت تھی فقہ اور اصولِ فقہ کی باضابطہ تدوین کی جائے، پیدا شدہ مسائل کے ساتھ پیدا ہونے والے امکانی مسائل کی تنقیح و تحقیق کی جائے، اصول اور ضوابط فقہیہ معین کئے جائیں۔

اللہ کی رحمت نازل ہو امام الائمہ سراج الامۃ ابوحنیفہ پر سب سے پہلے انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور بنواُمیّہ کے خاتمے کے بعد ہی وہ اپنے تلامذہ کی ایک جماعت کے ساتھ تدوینِ فقہ میں لگ گئے، اس طرح انہوں نے ایک عظیم الشان خدمت انجام دی۔

امام المحدثین عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

لقد زان البلاد و من علیها ... إمام المسلمین أبوحنیفة

بآثارٍ وفقهٍ فی حدیث ... کآیات الزبور علی الصحیفة

فما فی المَشْرِقَین له نظیر ولا بالمَغْرِبَیْن ولا بکوفة

ترجمہ: امام المسلمین ابوحنیفہ نے اپنے آثار اور فقہ و حدیث کے ذریعے ملک و ملت کو زینت بخشی۔ ان کی فقہ و علوم ایسے ہیں جیسے زبور کی آیات صحیفے پر لکھی ہوں۔ مشرقین میں ان کی کوئی نظیر نہیں، نہ مغربین میں، اور نہ ہی کوفہ میں۔

امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد اور ناصر مذہب، امام مزنیؒ فرماتے ہیں:

أبوحنیفةؒ أوّل مَن دوَّن علم الفقه و أفْرَدَه بالتالیف من بین الأحادیث البنویّة فبدء بالطهارة ثم بالصلاة ثم بسائر العبادات ثم المعاملات إلیٰ أن ختم الکتاب بالمواریث و قفاه فی ذٰلك مالك بن أنس وقفاه ابن جریج و هشیمؒ.

ترجمہ: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے علمِ فقہ کی تدوین کی، احادیث نبویہ کے درمیان فقہ کی مستقل کتاب لکھی اس کی تبویب کی، اس کی ابتداء طہارت سے کی پھر نماز پھر دوسرے عبادات پھر معاملات کے مسائل لکھے، یہاں تک کہ فرائض پر کتاب ختم کی، اس بارے میں مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بعد کام کیا اور ان کے بعد ان جریج اور ہشیم کے کام ہیں۔

اور علامہ سیوطیؒ "تبیض الصحیفة" میں رقمطراز ہیں:

من مناقب أبی حنیفة التی انفرد بها أنه أوّل من دوَّن علم الشریعة و رتَّبه أبواباً ثمَّ تابعه مالك فی ترتیب المؤطا، لم یسبق أبا حنیفة أحد و بهذا قال الشافعیؒ: الناس عیال أبی حنیفة فی الفقه.

ترجمہ: ابوحنیفہ کی منقبت میں ایک یہ ہے کہ جس میں آپ یکتا و منفرد ہیں کہ آپ نے سب سے پہلے علم شریعت (احکامِ فقہیہ) کو مدون کیا اور اس کو باب در باب مرتب کیا پھر مالک

نے الموطا کی ترتیب میں آپ کی متابعت کی۔(اس باب میں) آپ سے پہلے کسی نے کام نہیں کیا اسی وجہ سے امام شافعیؒ کا فرمان ہے کہ لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔

کیفیتِ تدوین:

ابو حنیفہ کو اپنے استاد حمّاد کے انتقال کے بعد غالبا تدوینِ فقہ کا خیال پیدا ہو چکا ہو گا، جب کہ اسلامی مملکت کا رقبہ سندھ سے اندلس تک طولا اور شمالی افریقہ سے ایشائے کوچک تک عرضا پھیلا ہوا تھا، اسلامی مدنیت میں بڑی وسعت آچکی تھی عبادات و معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے کہ ایک مرتب قانون کے بغیر محض روایتوں اور وقتی طور پر واقعات و نوازل میں غور و فکر سے کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا اس کے علاوہ سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے فقہی تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی تھی جس کا اب تک دستور تھا، ان حالات میں قدرتی طور پر اس خیال کا آنا ناگزیر تھا کہ فقہ کے جزئیات مسائل کو غور و فکر کے ساتھ اصول و ضوابط کے ماتحت ترتیب دے کر فن بنا دیا جائے اور اس فن کی کتابیں لکھی جائیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی طبیعت ابتداء سے مجتہدانہ اور غیر معمولی طور مقننانہ واقع ہوئی تھی، علم کلام کے بحث و جدل نے اس کو اور جلا دے دی تھی، تجارت کی وسعت نے معاملات کی ضرورتوں سے بھی خوب مطلع کر دیا تھا، اطرافِ بلاد سے ہر روز سیکڑوں ضروری فتوے آتے تھے، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ملک کو اس کی کس قدر حاجت ہے۔ قضاۃ، احکام اور فیصلوں میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ بھی سامنے تھیں، غرض امام صاحب ۱۳۲ھ میں اس طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

تدوینِ فقہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ عملی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب شریعت کے متعلق کتاب و سنّت کی باتیں جو متفرق طور پر اہلِ علم میں شائع ہیں، ان میں ترتیب اور نظام قائم کر دیا جائے اور مسلمانوں کے عمل کے لیے آخری فیصلہ کن صورت متعیّن کردی جائے۔ مگرچوں کہ شریعتِ محمّدی قیامت تک کے لیے ہے، نئے نئے حوادثات و مسائل ہوتے رہیں گے، ان کے متعلق عین وقت پر کتاب و سنّت سے حکم معلوم کرنے کے بجائے امکانی حد تک پہلے سوچ سمجھ کر تمام حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے احکام معین کر دینا بھی اس کا ثانوی مگر اہم مقصد تھا، اس مقصد ثانوی کے لحاظ سے کوفہ فقہ کے مرکز ہونے کی بہت عمدہ صلاحیت رکھتا تھا، مختلف عربی اور عجمی تہذیبیں وہاں جمع تھیں قسم قسم کے مسائل وہاں موجود تھے، اہلِ علم کا بھی کافی مجمع تھا، اس کے مقابلے میں عرب کے دوسرے شہروں کی تہذیب خالص عربی اور سادہ تھی۔

جامع فقہ کی تدوین کے لیے ایسے مقام کی ضرورت تھی جو ہر قسم کے مسائل کا جامع ہو، ابو حنیفہ جس اعلیٰ پیمانے اور مضبوط طریقہ پر فقہ کی تدوین کرنا چاہتے تھے وہ وسیع اور پر خطر کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے کام کو صرف اپنی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اپنے ہزاروں شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص چن لیے جس میں اکثر خاص خاص علوم کے ماہر تھے، جنکی تکمیل فقہ کے لیے ضرورت تھی، یہ حضرات اپنے اپنے فن کے استاذ زمانہ تسلیم کئے جا چکے تھے ”مناقبِ موفق“ میں ہے:

فوضع أبوحنيفة مذهبه شورى بينهم لم يستبد فيه بنفسه دونهم.

ترجمہ: ابوحنیفہ نے اپنے مذہب کو باہمی مشورہ پر مبنی کردیا مجلس شوری سے الگ ہوکر فقہ کی تدوین کو صرف اپنی ذات سے وابستہ نہیں رکھا۔

امام طحاویؒ نے بسند متّصل اسد بن فرات تلمیذ مالک سے نقل کیا ہے کہ اراکین مجلسِ تدوینِ فقہ چالیس تھے سب کے سب فقہ میں درجۂ اجتہاد تک پہنچے ہوئے تھے، ان میں دس ممتاز ترین اہلِ علم پر مشتمل ایک خاص مجلس بھی تھی، جس کے رکن امام ابویوسف، زفر، داود طائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد اور یحیٰ بن ابی زائدہ وغیرہ رحمھم اللہ تعالیٰ تھے۔

مجلسِ تدوینِ فقہ کے متعلق وکیع بن الجراح مشہور محدث کا قول ہے۔

كيف يقدر أبوحنيفة أن يخطئ و معه مثل أبی يوسف و زفر و محمد فی قياسهم و اجتهادهم و مثل يحيیٰ بن زائدة و حفص بن غياث و حبّان و مندل فی حفظهم للحديث و معرفتهم به والقاسم بن معن وهو ابن عبدالرحمن بن عبدالله بن مسعود فی معرفته باللغة العربية و داؤد بن نصير الطائی و فضيل بن عياض فی زهدهما و ورعهما فمن كان أصحابه هؤلاء و جلسائه لم يكن ليخطئ لأنه إن أخْطأ ردّوه إلى الحق.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ کیسے خطا کرسکتے ہیں جب کہ ان کے ساتھ ابویوسف اور زُفَر اور محمد جیسے شاگرد موجود ہیں اپنے قیاس اور اجتہاد میں، اور یحیٰ بن زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے لوگ موجود ہیں حدیث کے حفظ اور اس کی معرفت میں، اور قاسم بن معن جو کہ عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود کے بیٹے ہیں عربی زبان کی معرفت میں، اور داؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاض موجود ہیں اپنے زہد اور ورع میں۔ پس جس کے اصحاب ایسے ہوں اور ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے والا ہو وہ خطا نہیں کرسکتا، کیوں کہ اگر وہ کبھی خطا کرے تو یہ سب اسے حق کی طرف لوٹادیتے ہیں۔)

ابو حنیفہ نے طریقۂ استنباط یہ رکھا کہ پہلے جوابِ مسئلہ کتاب اللہ سے استباط کی کوشش کی جاتی ہے اگر اس میں کامیابی ہوجاتی ہے، خواہ کتاب اللہ کی عبارۃ النص سے ہو یا دلالۃ النص سے ہو یا اشارۃ النص سے ہو یا اقتضاء النص سے تو اسی کو متعیّن فرمادیتے، اگر کسی نہج سے کتاب اللہ سے براہ راست اس کا سراغ نہیں ملتا یا فیصلہ نہیں ہوسکتا تو پھر احادیث نبویہ میں تفتیش فرماتے۔

آخری بات جس پر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، امام صاحب کی نظر اس پر رہتی تھی اور اسی کو اختیار کرتے تھے، اگر حجازی اور عراقی صحابہ کی مرفوع حدیثوں میں اختلاف ہوتا تو بنابر فقہ راوی، فقیہ کی روایت کو ترجیح دیتے، اگر احادیث نبویہ سے فیصلہ نہ ہوسکتا تو اہل افتاء صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فیصلے تلاش فرماتے، اجماع کی طرف رجوع کرتے، ایسے موقع پر اہلِ عراق صحابہ اور تابعین کے مذاہب کو اختیار فرماتے۔ اگر یہاں بھی نہ ملتا تو قیاس واستحسان سے مسئلہ کا حل فرماتے، نصوص میں ضابطہ کلیہ اور واقعات جزئیہ کا اگر تعارض ہوتا تو ضابطہ کی نص کو ترجیح دیتے اور واقعہ جزئی کی توجیہ کرتے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا، اب تک اہل افتاء اور قضاۃ کا یہی دستور تھا کہ واقعہ کے واقع ہوجانے کے بعد جواب سوچتے تھے، کوئی مدون قانون جو کتاب وسنّت سے ماخوذ ومرتب ہواان کے سامنے نہیں تھا، بلکہ وقوع سے پہلے شرعی حکم سوچنے کو معیوب جانتے تھے، ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس دستور کے خلاف تھے، فرماتے ہیں:

”اہلِ علم کو چاہیے کہ جن باتوں میں لوگوں کو مبتلا ہونے کا امکان ہے ان کو سوچ لینا چاہئے تاکہ اگر واقع ہی ہوجائیں تو انہیں انوکھی بات نظر نہ آئے جس سے لوگ پہلے سے

واقف نہ ہوں، بلکہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان امور میں کسی کو مبتلا ہی ہونا پڑے تو شرعا ابتلا کے وقت کیا کرنا چاہئے اور مبتلا ہونے کے بعد شریعت نے ان کے لیے کیا صورت بتائی ہے۔"

قیس بن ربیعؒ کا مشہور قول ہے: كان أبوحنيفة أعلم الناس بما لم يكن. ابوحنیفہ ان مسائل کو جو واقع نہ ہوئے ہوں سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔

اسی بنا پر مجلس تدوین میں ابوحنیفہ نے ان تمام فقہی مسائل پر بتفصیل غور فرمانا شروع کیا جن کا واقع ہونا ممکن تھا۔ مجلس تدوین کا طریقہ یہ تھا امام صاحب کے اردگرد اراکین مجلس بیٹھ جاتے امام صاحب ایک ایک کو بصورتِ سوال پیش کرتے اور لوگوں کے خیالات الٹتے پلٹتے، جو کچھ مجلس کے اراکین کی معلومات ہوتیں، سنّتے، جو اپنا خیال ہوتا ظاہر فرماتے، اگر تمام اراکین جواب مسئلہ میں متفق ہوجاتے تو اسی وقت قلمبند کرلیا جاتا۔ خدمت کتابت اسد بن عمر، یحییٰ بن ذکریا بن ابی زائدہ اور امام ابویوسفؒ سے متعلق تھی، اختلاف کی صورت میں نہایت آزادی کے ساتھ بحثیں شروع ہوجاتیں اور یہ بحث کبھی مہینوں تک قائم رہتی، تلامذۂ امام اپنے اپنے علم اور معلومات کے اعتبار سے بحث کرتے اور ردّ وقدح جاری رہتی، ابوحنیفہ خاموشی سے سب کی تقریریں اور دلائل سنّتے، البتہ بیچ بیچ میں آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ آیت: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ (١٧) الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾ [الزمر: ١٧-١٨] جاری ہوجاتی۔ جب باتیں شروع ہوکر بہت بڑھ جاتیں تو امام صاحب اپنی تقریر شروع فرماتے۔ بالآخر امام صاحب ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا اور مسئلہ کا ایک پہلو متعیّن ہوجاتا اور لکھ لیا جاتا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلے کے بعد بھی بعض اراکین اپنی اپنی رائے پر قائم

رہتے توسب کے اقوال قلم بند کر لیے جاتے، اس کا بھی التزام تھا کہ جب تک شوری کے تمام اراکین خصوصی جمع نہ ہوجائیں، کوئی مسئلہ طے نہ کیا جائے، یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ بحث مباحثہ کے بعد آخری فیصلہ کی صورت اختیار کرتا تواراکین شوری سب کے سب نعرہ تکبیر بلند کرتے، اللہ اکبر کہتے۔

تقریبًا بائیس برس کی مدّت میں امام صاحب کی مجلسِ تدوینِ فقہ کا مجموعۂ فقہی تیار ہوکر کتب ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مجموعہ تراسی ہزار دفعات پر مشتمل تھا۔ جس میں ۳۸/ ہزار مسائل عبادات سے متعلق تھے، باقی ۵۴ ہزار دفعات کا تعلق معاملات اور عقوبات سے تھا۔ اس میں انسان کے دنیوی کاروبار کے متعلقہ آئین و دستور اور معاشیات وسیاسیات اور منزلیات کے متعلقہ قوانین سب ہی تھے، انہی مسائل کے ضمن دقائق نحواور حساب کے ایسے ایسے دقیق مسائل بھی تھے جن کے سمجھنے کے لیے عربیت وغیرہ کے ماہرین کی ضرورت ہو، اس مجموعہ کی ترتیب اس طرح تھی کہ اوّل باب الطہارۃ، باب الصلاۃ پھر عبادات کے دوسرے ابواب ان کے بعد معاملات اور عقوبات کے ابواب تھے آخر میں باب المیراث تھا۔

یہ مجموعہ ۱۴۴ھ کے قبل مکمل ہوچکا تھا مگر بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے کیوں کہ بغداد جانے پر جیل خانے میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا(آپ ۱۴۵ھ کے بعد جیل گئے تھے)امام محمدؒ کا تعلق امام صاحب کی مجلس سے وہاں ہوا، اضافہ کے بعد اس مجموعہ کے مسائل کی تعداد ۵/ لاکھ تک پہنچ گئی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے: كتبتُ كتب أبي حنيفة غير مرَّة كان يقع فيها زايادات فا كتبها. میں نے ابوحنیفہ کی کتابوں کو متعدّد بار لکھا، ان میں اضافے بھی ہوتے رہے ان اضافوں کی بھی لیا کرو۔

اس مجموعے نے امام صاحب کے زمانے میں قبولیت حاصل کی، جس قدر اجزاء تیار ہوتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ملک میں اس کی اشاعت ہوجاتی تھی، جب یہ مجموعہ مکمل ہوچکا تو ابوحنیفہ نے اپنے تلامذہ کو جمع ہونے کا حکم دیا، کوفہ کی جامع مسجد میں ایک ہزار اہلِ علم شاگرد جمع ہوئے جن میں ۴۰؍ وہ تھے جو مجلسِ تدوین کے رکن اور درجۂ اجتہاد تک پہنچے ہوئے تھے، امام صاحب نے انہیں قریب بٹھایا اور اس طرح تقریر فرمائی:

"میرے دل کی مسرتوں کا سارا سرمایہ صرف تم لوگوں کا وجود ہے، تمہاری ہستیوں میں میرے حزن وغم کے ازالے کی ضمانت پوشیدہ ہے۔ فقہ (اسلامی قانون) کی زین تم لوگوں کے لیے کس کر میں تیار کر چکا ہوں، اس کے منہ پر تمہارے لیے لگام چڑھا چکا ہوں، اب تمہارا جس وقت جی چاہے اس پر سوار ہوسکتے ہو، میں نے ایسا حال پیدا کر دیا ہے کہ لوگ تمہارے نقش قدم کی جستجو کریں گے اور اسی پر چلیں گے۔ تمہارے ایک ایک لفظ کو لوگ تلاش کریں گے، میں نے گردنوں کو تمہارے لیے جھکا دیا اور ہموار کر دیا اب وقت آگیا ہے کہ تم سب علم کی حفاظت میں میری مدد کرو، تم سب لوگوں کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں اور علم کا جو آپ لوگوں کو ملا ہے اس کی عظمت وجلالت کا حوالہ دیتا ہوں، میری تمنا ہے کہ اس علم کو محکوم ہونے کی بے عزتی سے بچاتے رہنا۔ اور تم میں سے کسی کو قضا کی ذمہ داریوں میں مبتلا ہونا پڑے تو میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ایسی کمزوریوں کا جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوں جان بوجھ کر اپنے فیصلوں میں جو لحاظ کرے گا اس کا فیصلہ جائز نہ ہوگا، نہ اس کیے لیے خدمت قضا حلال ہے، نہ اس کی تنخواہ لینا درست ہے، قضا کا عہدہ اسی وقت تک صحیح اور درست ہے جب تک قاضی کا ظاہر وباطن ایک ہو، اسی قضا کی تنخواہ حلال ہے، بہرحال ضرورت کو دیکھ کر اس عہدے کی

ذمہ داریوں کو تم میں سے جو قبول کرے میں اس کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا کی عام مخلوق اور اپنے درمیان روک ٹوک کی چیزوں کو مثلاً دربان، حاجب وغیرہ کو حائل ہونے نہ دے، پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھے، ہمیشہ لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کو تیار رہے، امام یعنی مسلمانوں کا امیر اگر مخلوق خدا کے ساتھ کسی غلط رویہ کو اختیار کرے تو اس امام سے قریب ترین قاضی کا فرض ہوگا کہ اس سے باز پرس کرے۔" (معجم المصنفین، بحوالہ تاریخ تدوینِ فقہ)

اس تقریر کے بعد مجموعہ فقہی کی اہم حیثیت واضح ہوگئی، ملک میں شہرت عام ہوگئی۔

امام صاحب کے عہد میں عدلیہ کی آزادی مفقود تھی، اس لیے انہون نے خود عہدہ قضا قبول نہیں کیا اور اس آزادی کی جدوجہد میں وہ شہادتِ سری کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

امام صاحب کے بعد جب عدلیہ کی آزادی میسر ہوئی، امام صاحب کے تقریبًا ۵۰؍شاگردوں نے مختلف وقتوں میں عہدہ قضا قبول کیا اور وہ امام صاحب کے مجموعہ فقہی کے مطابق فیصلہ کرنے لگے، ہارون رشید کے عہد میں امام ابویوسف قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، مملکت عباسیہ میں مغرب سے مشرق تک قاضیوں کا تقرر انہی کے ہاتھوں انجام پانے لگا۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدون فقہ کا نام فقہِ حنفی ہوا جو سارے ملک میں پھیل گئی۔ یحییٰ بن آدم کا قول ہے: قضیٰ به الخلفاء والأئمة والحُكّام واستقر عليه الأمر. کہ خلفاء ائمہ اور حکام ابوحنیفہؒ کے مدونہ قوانین پر فیصلہ کرنے لگے اور بالآخر اسی پر عمل قائم ہوگیا۔ (تاریخِ علمِ فقہ)

مدوِّنِ اوّل تو ابوحنیفہ ہی ہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا البتہ کوئی بھی فن ایک دم مدون نہیں ہوتا آہستہ آہستہ تدوین کے مراحل طے ہوتے ہیں وہ ترتیب اس طرح علماء نے بیان فرمائی ہیں۔

قالوا: الفقه زرعه عبدالله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه و سقاه علقمة و حصده إبراهيم النخعى و داسه حمّاد و طحنه أبوحنيفة و عجنه أبويوسف و خبزه محمد فسائر الناس ياكلون من خبزه. (رحمة الله عليهم)

قوله: (زرعه) أي أوّل مَن تكلَّم باستنباط فروعه عبدالله بن مسعود الصحابى الجليل أحد السابقين والبدريين والعلماء الكبار من الصحابة، أسلم قبل عمر رضى الله تعالىٰ عنهما قال النووى فى التقريب: وعن مسروق أنه قال: انتهى علم الصحابة إلىٰ ستة رضى الله تعالىٰ عنهم أجمعين. ثم علم الستة إلىٰ على و عبدالله بن مسعود رضى الله عنها.

قوله: (و سقاه) أى أيده و وضّحه علقمة بن قيس بن عبدالله بن مالك النخعى الفقيه الكبير عم الأسود بن زيد وخال إبراهيم النخعى، ولد فى حياة النبى ﷺ و أخذ القرآن والعلم من ابن مسعود و على و عمر و أبى الدرداء و عائشة رضى الله عنهم أجمعين.

قوله: (حصده) أى جمع ما تفرق من فوائده ونوادره و هيّأه للانتفاع به إبراهيم بن زيد بن الأسود ابوعمران النخعى الكوفى، الإمام المشهور الصالح الزاهد روى عن الأعمش و خلائق توفى سنة ست أو خمس تسعين.

قوله: (وداسه) أى اجتهد فى تنقيحه و توضيحه حمّاد بن مسلم الكوفى شيخ الإمام وبه تخرّج وأخذ حمّاد بعد ذلك عنه، قال الإمام: ما صليت صلاة إلا استغفرت له مع والدى مات سنة مئة و عشرين.

قوله: (وطحنه) أى اكثر أصوله و فرع فروعه وأوضح سبُلَه إمام الأئمة و سراج الأمة أبوحنيفة فإنه اوّل دوّن الفقه ورتَّبه أبواباً و كتباً على نحوما عليه اليوم وتبعه مالك فى ”مؤطئه“ ومن كان قبله إنما كانوا تعمدون على

حفظهم و هو أوّل من وضع كتاب الفرائض و كتاب الشروط، كذا فى الخيرات الحسان فى ترجمة أبى حنيفة النعمان رحمه الله تعالىٰ للعلامة ابن حجر رحمه الله تعالىٰ.

قوله: (و عجنه) أى دقق النظر فى قواعد الإمام وأصوله و اجتهد فى زيادة استنباط الفروع منها والأحكام، تلميذ الإمام الأعظم أبويوسف يعقوب بن إبراهيم قاضى القضاة، فإنه كما رواه الخطيب فى "تاريخه": اوّل من وضع الكتب فى أصول الفقه على مذهب أبى حنيفة و أملى المسائل و نشرها، و بث علم أبى حنيفة فى أقطار الأرض وهو أفقه أهل عصره ولم يتقدمه أحد فى زمانه وكان النهاية فى العلم والحكم والرياسة ولد سنة۱۱۳ هجرى و توفى ببغداد سنة ۱۷۲ هجرى.

قوله: (وخبزه) أى زاد فى استنباط الفروع و تنقيها وتهذيبها بحيث لم تحتج إلىٰ شيئ آخر الإمام محمد بن الحسن الشيبانى تلميذ أبى حنيفة و أبى يوسف محرِّر المذهب النعمانى المجمع على فقاهته و نباهته. رُوى أنه سال رجل المزنى عن أهل العراق فقال: ما تقول فى أبى حنيفة؟ فقال: سيدهم، قال فابويوسف؟ قال: أتبعهم للحديث، قال فمحمد بن الحسن؟ قال أكثرهم تفريعاً قال فزفز؟ قال: أحدّهم قياساً ولد سنة ۱۳۲ هجرى وتوفى سنة ۱۸۹ هجرى.

قوله (زرعه): یعنی سب سے پہلے جو شخص فقہ کی فروعات کے استنباط کی بات کرنے والے ہوئے، وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، جو بڑے جلیل القدر صحابی، سابقینِ اوّلین میں سے، بدر میں شریک ہونے والے، اور صحابہ کے بڑے علماء میں سے ہیں۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے اسلام لائے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے التقریب میں فرمایا ہے:

مسروق کہتے ہیں کہ صحابہ کا علم چھ ہستیوں پر ختم ہوا۔ پھر چھ کا علم حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما تک پہنچا۔

قولہ (وسقاہ): یعنی اس علم کی آبیاری، توضیح اور تقویت علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک نخعی نے کی۔ وہ بڑے فقیہ تھے، اسود بن زید کے چچا اور ابراہیم نخعی کے ماموں تھے۔ ان کی ولادت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہوئی۔ قرآن اور علم انہوں نے ابن مسعود، علی، عمر، ابودرداء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سب سے حاصل کیا۔

قولہ (حصدہ): یعنی اس کے منتشر فوائد اور نکتوں کو جمع کرکے فائدہ اٹھانے کے قابل بنایا ابراہیم بن یزید بن اسود ابو عمران نخعی نے، جو کوفہ کے مشہور امام، صالح اور زاہد تھے۔ انہوں نے اعمش وغیرہ سے روایت کی۔ ان کا انتقال ۹۵ یا ۹۶ ہجری میں ہوا۔

قولہ (وداسہ): یعنی اس کی مزید تنقیح و وضاحت میں جد اجتہاد کیا حمّاد بن ابی سلیمان کوفی نے، جو امامِ اعظم کے استاد تھے۔ امامِ اعظم نے انہی سے علم حاصل کیا۔ امام صاحب فرمایا کرتے تھے: میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی مگر اپنے والدین اور حمّاد کے لیے استغفار کیا۔ ان کا انتقال ۱۲۰ ہجری میں ہوا۔

قولہ (وطحنہ): یعنی اصول کی کثرت کی، فروع کو تفصیل سے بیان کیا اور اس کے راستوں کو واضح کیا امام الائمہ، سراج اُمّت امامِ اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے۔ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ کو مدون کیا، ابواب اور کتب کی ترتیب دی جیسی آج تک چلی آرہی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی کی پیروی میں موطا تصنیف کی۔ آپ سے پہلے لوگ صرف اپنے حفظ پر اعتماد کرتے تھے۔ آپ ہی وہ پہلے ہیں جنہوں نے کتاب الفرائض اور

کتاب الشروط لکھیں۔ جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب الخیرات الحسان فی تراجم الامام النعمان میں بیان کیا۔

قولہ (وعجنہ): یعنی امام کے قواعد واصول میں گہری نظر ڈالی، ان سے مزید فروع و احکام کے استنباط میں اجتہاد کیا اور ان کے راستہ کو واضح کیا امامِ اعظم کے شاگرد خاص، ابویوسف یعقوب بن ابراہیم نے، جو قاضی القضاۃ تھے۔ جیسا کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں نقل کیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کے مذہب پر اصولِ فقہ کی کتابیں مرتب کیں، مسائل املا کیے اور ان کو پھیلایا۔ انہی کے ذریعے امام ابوحنیفہ کا علم دنیا بھر میں عام ہوا۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے فقیہ تھے، اپنے علم وفقہ اور قیادت میں یکتا تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۱۳ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۸۲ ہجری میں بغداد میں ہوئی۔

قولہ (وخبزہ): یعنی فروع کے مزید استنباط، ان کی تنقیح اور تہذیب اس درجے تک کی کہ مزید کسی چیز کی حاجت باقی نہ رہی، یہ کام امام محمد بن حسن شیبانی نے کیا، جو امام ابوحنیفہ اور ابویوسف دونوں کے شاگرد تھے۔ وہ امام نعمان کے مذہب کے محقق اور مرتب تھے، جن کی فقاہت و نابغگی پر اجماع ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے امام مزنی سے اہلِ عراق کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے پوچھا: ابوحنیفہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کہا: وہ ان کے سردار ہیں۔ کہا: ابویوسف؟ کہا: وہ سب سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے والے ہیں۔ کہا: محمد بن حسن؟ کہا: وہ سب سے زیادہ تفریع کرنے والے ہیں۔ کہا: زفر؟ کہا: ان میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے ہیں۔ امام محمد کی پیدائش ۱۳۲ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۸۹ ہجری میں۔

تدوینِ فقہ کے دورِ اوّل میں وہ چند مجتہدین جن کا ظہور ہوا:

دورِ تدوین دورِ اجتہاد تھا، جس میں بہت سے مجتہدینِ اہلِ مذاہب پیدا ہوئے جو اپنا خاص فقہی نظریہ رکھتے تھے اور اسی کے مطابق فتوے دیتے، کچھ لوگ ان کے پیرو تھے ۱۳/ان میں مشہور و معروف ہیں، ان میں سے چار جمہور اہلِ اسلام کے وہ آئمہ ہیں جن کے مذاہبِ مدوَّنہ نے شہرت حاصل کی اور یہ شہرت یکساں اب تک باقی ہے۔ جمہور اہلِ اسلام آج بھی انہی چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں۔

اس دور کے ائمۂ اربعہ کے علاوہ مجتہدین کا بھی اپنا ایک خاص فقہی نظریہ تھا انہوں نے کسی خاص امام کا اپنے کو تابع نہیں بنایا، ان ائمہ میں سے اکثر کا مذہب اسی دور میں ختم ہو گیا۔ مثلاً:

(۱) امام لیث بن سعدؒ (۹۴۔۱۷۵ھ):

یہ مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی کہا جاتا ہے کہ تفقہ میں ان کا درجہ امام مالک اور امام شافعیؒ سے کم نہیں تھا، خود امام شافعیؒ ان کو مالک سے زیادہ فقیہ قرار دیتے تھے لیکن ان کے مذہب کو زیادہ رواج حاصل نہیں ہو سکا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔

(۲) امام سفیان ثوریؒ (۹۷۔۱۶۱):

آپ کا مذہب کوفہ میں کچھ دنوں رائج رہ کر ائمۂ اربعہ کے مذہب میں جلد ہی گم ہو گیا۔ مکمل نام ابو عبداللہ سفیان بن سعید ثوری ہے کوفہ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں وفات پائی، فقہ اور حدیث دونوں پر نظر تھی۔ عام طور پر ان کی آراء ابو حنیفہ کی آراء سے قریب ہوتی ہیں، ابتداءً امام صاحب سے چشمک تھی، پھر بعد کو غلط فہمی دور ہو گئی اور ابو حنیفہ کے قدرداں ہو گئے۔

(۳) امام ابو ثورؒ ابراہیم بن خالد بن ابی ایمان کلبی بغدادی:

۲۴۰ ہجری بغداد میں وفات ہوئی۔ امام شافعیؒ کے شاگرد تھے، ابن حیانؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

كان أحد ائمة الدنيا فقها و علما و ورعا وفضلا، صنف الكتب و فرع على السنن وذب عنها يتكلم فى الرأى فيخطئ و يصيب. قال ابن عبدالبر: له مصنفات كثيرة منها كتاب ذكر فيه اختلاف مالك والشافعي وذكر مذهبه فى ذلك و هو أكثر مَيلا إلى الشافعي فى هذا الكتاب وفى كتبه كلها.

ترجمہ: وہ فقہ وعلم پرہیزگاری اور منقبت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے ائمہ میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کتابیں تصنیف کیں، سنّتوں پر فروع (مسائل) مرتب کیے اور سنّتوں کا دفاع کیا۔ رائے کے باب میں گفتگو کرتے تو کبھی خطا بھی ہو جاتی۔ ابن عبد البرؒ نے کہا: ان کی بہت سی تصنیفات ہیں، جن میں ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے امام مالک، امام شافعی کے اختلاف کا ذکر کیا ہے اور اس میں اپنا مسلک بھی بیان کیا ہے، اور اس کتاب میں اور اپنی باقی تصنیفات میں وہ زیادہ تر امام شافعی کی طرف مائل ہیں۔

(۴) امام حسن بصریؒ (۲۱۔۱۱۰ھ):

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تابعین کے عظیم ائمہ اور اوّلیاء میں ہوتا ہے۔ آپ کا اصل نام ابو سعید حسن بن یسار البصری ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ خیرہ، ام المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں۔ اس نسبت کی وجہ سے آپ کو بچپن ہی سے اہلِ بیت نبوی اور صحابۂ کرام کی پر نور صحبت میسر آئی۔

مدینہ طیبہ کی بابرکت فضاؤں میں پرورش پانے کے سبب آپ کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت سے فیض حاصل ہوا۔ روایت ہے کہ آپ نے ستر سے زیادہ صحابۂ کرام کو دیکھا اور ان سے علم حاصل کیا۔ آپ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور دیگر جلیل القدر صحابہ کے شاگرد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی علمی شخصیت ایک وسیع اور مضبوط بنیاد پر قائم ہوئی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۱۱۰ ہجری میں بصرہ میں ہوا۔ آپ کے جنازے میں اس قدر لوگ شریک ہوئے کہ بصرہ کی تاریخ میں اتنا بڑا اجتماع پہلے کبھی نہ دیکھا گیا۔ آپ کا مذہب بھی کچھ عرصہ رہ کر معدوم ہو گیا۔

(۵) نیشاپور میں اسحاق بن راھویہ (۱۶۱۔۲۳۸ھ)

مکمل نام: اسحاق بن ابراھیم بن مخلد الحنظلی التیمی المروزی، ابویعقوابن راھویہ

اپنے زمانے میں خراسان کے بڑے عالم تھے، مَرْو کے باشندے تھے، بڑے پائے کے حافظ حدیث تھے، احادیث کو جمع اور محفوظ کرنے کے لیے کئی شہروں کی گرد چھانی، آپ سے حدیث اخذ کرنے والے میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، جیسے محدثین سرفہرست ہیں۔

ان کے والد مکہ مکرمہ کے راستے میں پیدا ہوئے تھے تو مَر ْو والوں نے ان کو راھویہ نام دیا جس کا معنی ہوتا ہے وہ جو راستے میں پیدا ہوا۔ بعد میں امام اسحاقؒ نے نیشاپور کو اپنا وطن بنایا اور وہیں وفات بھی ہوئی۔

(۶) امام عبدالرحمٰن بن عمرو الدمشقی الاوزاعی:

۸۸ھ میں بعلبک میں پیدا ہوئے، جوان ہونے کے بعد علمِ حدیث کی تحصیل کی،

عطا بن ابی رباح اور زہری وغیرہ سے حدیثیں سنیں، صاحبِ مذہب و افتا ہوئے، ان کا شمار ان محدثین میں ہے جو قیاس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اہلِ شام میں امام اوزاعیؒ کا مذہب رائج تھا، وہ شام کے قاضی بھی تھے۔ شام سے دولتِ بنی امیہ کے خاتمے کے بعد جب اندلس میں اموی حکومت قائم ہوئی تو اوزاعیؒ کا مذہب بھی اندلس گیا، تیسری صدی تک رائج رہا، چوتھی صدی میں امام شافعیؒ کے مذہب کے مقابلے میں شام سے اور مالک کے مذہب کے مقابلے میں اندلس سے ان کے مذہب کا چراغ بجھ گیا امام اوزاعیؒ نے ۱۵۷ھ میں وفات پائی۔

(۷) الطبری:

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بغدادی طبری۔ ۲۲۴ھ میں آمل طبرستان میں پیدا ہوئے اور تحصیلِ علم کے لیے تمام شہروں کی سیاحت کی، ربیع بن سلیمان سے فقہِ شافعی پڑھی، اور یونس بن عبدالاعلیٰ اور ابن عبدالحکیم سے فقہِ مالکی حاصل کی، ابو مقاتل سے فقہِ حنفی پڑھی۔ محدثین بلاد و امصار سے حدیث سنی، وہ نہایت وسیع العلم کتاب اللہ کے حافظ، احادیث نبویہ کے ماہر، اصول صحابہ و تابعین سے واقف اور تاریخِ عالَم کے عالِم تھے۔

ان کی تصنیفات میں ''تاریخِ طبری'' اور ''تفسیرِ طبری'' نہایت مشہور کتابیں ہیں جن کے مثل دوسری کتاب نہیں، تاریخ اور تفسیر میں بعد والوں کا زیادہ اعتماد انہی کتابوں پر رہا۔ حدیث میں امام طبریؒ نے تہذیب الآثار لکھی، اختلاف الفقہا بھی ان کی معروف کتاب ہے، ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

امام ابن جریر طبریؒ وسعت علم و ذکاوت سے درجۂ اجتہاد مطلق تک پہنچے، اپنے مذہب پر خود کتابیں لکھیں، جن کے نام یہ ہیں: لطیف القول، کتاب البسیط، کتاب الحکام

والمحاضر والسجلات۔ امام ابن جریر طبریؒ کا مذہب مشرق کے بعض بلاد میں رائج ہوا۔ ختم ہوجانے والے مذاہب میں اسی کو زیادہ دنوں تک زندگی حاصل رہی اور پانچویں صدی تک بعض مقامات میں معمول بہ رہا پھر فنا ہوگیا۔

(۸) الظاہری:

ابو سلیمان داؤد بن علی بن خلف الاصفہانی ۲۰۲ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اسحاق بن راہویہ اور ابوثور سے علم حاصل کیا۔ اوائل میں امام شافعیؒ کے بڑے حامی تھے بعد میں خود اپنا نیا مسلک ایجاد کیا جس کی بنیاد ظاہر کتاب و سنّت پر رکھی، وہ کتاب و سنّت کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں، اگر کوئی نص نہ ملے تو اجماع پر عمل کرتے ہیں، قیاس بالکل نہیں مانتے، ادلۂ ثلاثہ میں حکم نہ ہونے کی صورت میں اباحت کے قائل ہیں۔

داؤد ظاہری کا انتقال ۲۷۵ھ میں ہوا بغداد میں مدفون ہوئے، داؤد ظاہریؒ نے خود بہت سی کتابیں لکھیں، مثلاً کتاب ابطال القیاس، کتاب ابطال التقلید، کتاب خبر الواحد، کتاب الخبر الموجب للعلم، کتاب الحجۃ، کتاب الخصوص والعموم، کتاب المفسر والمجمل وغیرہ۔ داؤد ظاہری کے مذہب کی اشاعت ان کے بیٹے محمد اور ابوالحسن عبداللہ بن احمد بن محمد بن المفلس (صاحب تصانیف کثیرہ) نے کی۔ اس مذہب کے سب سے بڑے مؤلف ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی الظاہری (م ۴۵۶ھ) مؤلف کتاب المحلی ہیں مگر ان کے بعد ہی اس مذہب کا چراغ گل ہوگیا۔

(۹) سفیان بن عیینہ بن میمون الھلالی الکوفی، ابومحمد کنیت ہے۔

حرم مکی کے محدث ہیں کوفہ میں ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے، مکہ مکرمہ میں بودوباش اختیار کی مکہ مکرمہ ہی میں ۱۹۸ھ میں وفات ہوئی۔

آپ حافظ حدیث، وسیع العلم اور جلیل القدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: لولا مالك و سفيان لذهب علم الحجاز. آپ اَعور (کانے) تھے ستر سال آپ نے حج ادا فرمائے، حدیث میں آپ کی ایک کتاب ہے الجامع اور تفسیر میں ایک کتاب ہے۔ آپ کا مذہب بھی کچھ عرصہ رہ کر معدوم ہو گیا۔

مسلمانوں کا مذاہب اربعہ میں منحصر ہونا:

پانچویں صدی کے بعد جمہور اہلِ اسلام میں صرف ائمۂ اربعہ کے مذاہب باقی رہے۔ مذکورہ فقہا اپنی قوتِ اجتہاد اور لیاقتِ استنباط میں نہایت اعلیٰ درجہ کے حامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کے مذہب کو بقاء و استحکام حاصل ہو سکے۔ جس مذہب کو قابلِ اعتماد مدوِّن میسر آئے وہ خوب پھیلا، ابو حنیفہ نے اپنے تلامذہ کی جماعت کے ساتھ خود اپنی فقہ تدوین کی، ان کو اچھے شاگرد میسر آئے جو خود مجتہد، مصنف، قاضی اور قاضی گر تھے۔ اس لیے ان کا مذہب خوب پھیلا، بلکہ سب سے زیادہ پھیلا۔ امام شافعیؒ نے اپنی فقہ خود مدون کی، ان کو معتمد تلامذہ ملے جنہوں نے خوب انتصارِ مذہب کیا، اس لیے مذہب امام ابی حنیفہؒ کے بعد مذہب شافعی کی اشاعت ہوئی، مالک نے اپنے فقہی نظریہ کی اشاعت کی ان کے اچھے شاگردوں نے ان کی فقہ مدون کی۔ شافعیت کے بعد مالکیت پھیلی، امام احمد نے خود اگرچہ تدوینِ فقہ نہیں کی مگر اچھے شاگردوں نے ان کی فقہ تدوین کی اور اس کی اشاعت کی۔ ائمۂ ثلاثہ کے بعد ان کا مذہب پھیلا، اگرچہ پہلوں کے مقابلے میں کم پھیلا، الغرض ائمۂ اربعہ کے مذاہب چوں کہ مدون ہوئے، اچھے شاگردوں نے ان کی اشاعت کی، اس لیے ان مذاہب کی تقلید نے عمومی شکل اختیار کرلی، اس سلسلے میں امام شافعیؒ کا قول قابل

غور ہے، فرماتے ہیں: لیث، مالک سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن ان کے اصحاب نے ان کے علم کو ضائع کر دیا۔ مطلب یہ کہ ان کو ایسے شاگرد میسر نہ ہوئے جو ان کی فقہ کو مدون کرتے، اس لیے عوام میں اس کی اشاعت نہ ہوئی۔

تقلیدِ ائمۂ اربعہ کا عموم:

اوپر بیان ہو چکا کہ عہدِ صحابہ کے بعد جمہور مسلمانوں میں دو مذہب رائج تھے، عراق میں اہل الرائے کا مسلک اور حجاز میں اہل الحدیث کا طریقہ، عراقیوں کے امام و مرجع ابو حنیفہ تھے، جنہوں نے سب سے پہلے فقہ کی تدوین کی ان کا مرتبہ بقول مؤرخ ابن خلدون اس قدر بلند ہے کہ جس کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اس کی شہادت ماہرین فن خصوصاً امام مالک اور امام شافعیؒ نے دی۔

عراق چوں کہ نہایت متمدن تھا، مختلف تہذیبیں وہاں جمع تھیں، مسائل بہت زیادہ پیدا ہو چکے تھے اس لیے قیاس اور تفریع مسائل کی کثرت وہاں ناگزیر تھی، فقہِ حنفی بغایت رنگین، باضابطہ اور متنوع تھی، عقل و درایت کے بالکل مطابق تھی، اس لیے متمدن ممالک میں خوب پھیلی۔

دولتِ عباسیہ کے انحطاط کے بعد اکثر شاہانِ ممالکِ اسلامیہ کا مذہب حنفی رہا، ابو حنیفہ کے مقلد، عراق، ہندو پاک، چین، ماوراء النہر اور دوسرے بلاد عجم میں بہت پھیلے اور آج تک اسی کی کثرت ہے۔ حجاز و یمن، شام و روم اور مصر میں بھی مقلدین ابی حنیفہؒ کی ہمیشہ کثرت رہی، البتہ بلادِ مغرب اور اندلس میں حنفیت کا شیوع کم ہوا۔

اہلِ حجاز کے پیشوا مدینہ منورہ کے امام مالک بن انس ہوئے جو حجاز میں مروج احادیث

کے ماہر تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے احکام کے استنباط کی مزید قوت عطا کی تھی، مالک کی فقہ نہایت سادہ اور بے تکلف اور بدویت کے زیادہ مناسب تھی، تفریع مسائل اس میں زیادہ نہیں تھے، تعاملِ اہلِ مدینہ سے چوں کہ اکثر ضروری مسائل کا حل نکالا گیا تھا اس لیے ان کے یہاں قیاس کی زیادہ کثرت نہیں تھی، یہ مذہب مدینہ، حجاز اور اس کے بعد مصر ہوتا ہوا اہلِ مغرب اور اندلس میں زیادہ پھیلا، بقول ابن خلدون اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے لوگ تحصیلِ علم کے لیے مدینہ منورہ زیادہ آتے تھے اور امام مالک کی فقہ سیکھ کر جاتے تھے اور اس کی اشاعت کرتے تھے۔

اس طرح دوسری صدی کے وسط میں فقہ کے دو مرکز قائم ہوئے، کوفہ میں حنفی مرکز اور مدینہ میں مالکی، دونوں مرکزوں کے نصف صدی قیام کے بعد امام شافعیؒ قریشی نے دونوں مرکزوں کی فقہ سے ماخوذ نئی فقہ مدون کی، انہوں نے ابو حنیفہ کے شاگردوں سے کوفی فقہ سیکھی اور امام مالک سے مدنی فقہ حاصل کی، دونوں سے مخلوط نئی فقہ کی بنیاد ڈالی۔ امام شافعیؒ کا مذہب مصر میں ان کے زمانے میں رائج ہوگیا، حجاز و عراق، خراسان، ماوراء النہر میں بھی پھیلا، اگرچہ حنفیوں کے مقابلے میں اس کا شیوع کم تھا، تاہم مذہب شافعی، مذہبِ حنفی کا مدمقابل حریف رہا۔

مذہب امام شافعیؒ کے بعد چوتھے مذہب کے بانی امام احمد حنبلؒ ہوئے جو بڑے محدث تھے، امام شافعیؒ سے انہوں نے فقہ حاصل کیا اور تلامذہ امام ابی حنیفہؒ سے کوفی فقہ سیکھی، وہ عراق و حجاز کی حدیثوں کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے ماہر تھے، انہوں نے ایک نئے فقہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ مذہب تقریباً خالص حدیث کا مذہب تھا، حنبلی مذہب کے مقلد کم ہوئے، یہ مذہب نجد و شام میں زیادہ پھیلا، حجاز، مصر اور عراق میں بھی حنبلی ہوئے مگر کم ہوئے۔

مؤرخ ابن خلدون (م۸۰۶ھ) کا بیان ہے: دنیا میں صرف چار ائمہ کی تقلید جاری ہوئی اور دیگر ائمہ کے مقلدین کا نام و نشان نہیں رہا اور لوگوں نے خلاف کا دروازہ اور اس کے تمام طریقے بند کردیے۔ اس لیے کہ علمی اصطلاحات بکثرت قائم ہوکر رتبۂ اجتہاد تک پہنچنے سے مانع ہوگئی اور ڈر لگتا ہے کہ کہیں نااہل اور کمزور رائے رکھنے والے اپنے کو فقیہ کہلانا شروع کردیں تو جمہور نے صاف طور پر عجز و معذوری کا اظہار کرکے ان ائمہ کی تقلید کی طرف لوگوں کو متوجہ کردیا، یہاں تک کہ ہر شخص کسی نہ کسی امام کی تقلید سے مختص ہوگیا اور ایک امام کی تقلید چھوڑ کر دوسرے کی تقلید کو ناجائز اور ممنوع کردیا کیوں کہ ان میں تلاعب پائے جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے صرف ان چاروں کے مذاہب کی نقل اور تقلید رہ گئی مگر اصول تصحیح اور ان کی سند کی روایت کا اتصال شرط قرار پایا، آج کل اس کو تقلید فقہ کہتے ہیں اور بس! اور اس زمانے میں اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا ہے اور تمام اہل سنّت ان چاروں ائمہ کی تقلید سے مقلد ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ عقد الجید میں لکھتے ہیں: ”ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔“

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے مفصل یہ تین وجوہ بیان کئے ہیں:

(۱) اُمّت کا اجماع ہے کہ معرفتِ شریعت میں سلف کا اتباع کریں اور یہ مذاہبِ اربعہ چوں کہ سلف سے بسند صحیح ماخوذ ہیں، تمام مسائل منقح ہیں اس لیے ان کا اتباع ضروری ہوا۔

(۲) حدیث میں ہے: اتبعوا السواد الأعظم. (بڑے جتھے کی پیروی کرو) اور تمام مذاہب ختم ہوکر صرف چار ہی رہ گئے، سوادِ اعظم انہیں چار کی متبع ہوئی لہٰذا اتباعِ مذاہبِ اربعہ لازم ہوا۔

(۳)زمانہ طویل ہوگیا، امانتیں ضائع ہوگئیں لہٰذا علماء سوء یا ایسے لوگوں کی پیروی نہ چاہئے جن کے متعلق محقق نہیں کہ شرائط اجتہاد موجود ہیں یا نہیں اور تحقیق مشکل ہے اس لیے مذاہب اربعہ مشہورہ متبوعہ کی پیروی کی جائے۔" (بحوالہ تاریخ تدوینِ فقہ)

نیز عقد الجید میں لکھا ہے کہ تقلید دو طرح کی ہے واجب اور حرام پھر دونوں کی تفصیل کی ہے اور تقلید واجب کو" دلالۃ روایت کی پیروی" قرار دیا ہے اور آگے فرماتے ہیں:

"جو شخص کتاب وسنّت سے ناواقف ہے اس کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ بذات خود تتبع اور استنباط کر سکے، لازماً وہ کسی فقیہ سے دریافت کرے گا کہ فلاں مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا حکم کیا ہے؟ اور جب وہ فقیہ اس کو اس کو بتائے گا تو وہ اس کی اتباع کرے گا خواہ فقیہ کا یہ قول صریح نص سے ماخوذ ہو یا اس سے مستنبط ہو یا کسی منصوص پر مقیس ہو۔ یہ تمام صورتیں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہی کی صورتیں ہیں، اگرچہ یہ روایت دلالۃً ہے اور اس کی صحت پر نہ صرف قرناً بعد قرن پوری اُمّت کا اتفاق رہا ہے، بلکہ تمام اُمّتیں اپنے شرائع کے بارے میں اس صورت پر متفق ہیں۔"

اور شاہ صاحب نے جہاں تقلید پر تنقید کی ہے وہ اس تقلید پر کی ہے جس میں غیرِ نبی کو واجب الطاعت ہونے کا درجہ دے دیا جائے۔ اور اس کے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث کو بھی ردّ کر دیا جائے، اس قسم کے اعتقاد اور اس قسم کی تقلید کو شاہ صاحب کفر، دین میں تحریف، گمراہی اور حرام قرار دیتے ہیں، نیز شاہ صاحبؒ تقلید میں اعتدال کا مشورہ بھی دیتے ہیں، تقلید میں غلو کو پسند نہیں کرتے۔

مذاہبِ اربعہ کی تقلید کے جواز پر اُمّت کا اجماع ہے:

حضرت شاہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغۃ میں فرماتے ہیں:

پوری اُمّت نے یا ان میں سے قابلِ لحاظ لوگوں نے (یعنی اہلِ حق نے) ان چار مدون و منقح مذاہب کی تقلید کے جواز پر اتفاق کیا ہے اور یہ اجماع آج تک مستمر ہے اور اسی تقلید میں وہ مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور نفوس خواہشات پلا دیئے گئے ہیں اور ہر ذی رائے اپنی رائے پر ناز کرتا ہے۔

اور ''انصاف'' میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ: ''دو صدیوں کے بعد لوگوں میں مجتہد کی تقلید کا رجحان پیدا ہوا، اور بہت کم لوگ رہ گئے جو کسی معین مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہیں کرتے اور یہی چیز اس زمانہ میں واجب تھی۔''

یعنی دورِ نبوت سے دور ہو جانے کی وجہ سے اُمّت میں جو اختلاف پیدا ہو گئے تھے اور ناقص استعداد والے مجتہدین کی جو بھرمار ہو گئی تھی، اور ہر شخص اپنی رائے پر الجھنے لگا تھا اس کا علاج سوائے تقلیدِ شخصی کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا، اسی لیے تقلیدِ شخصی اسی زمانہ سے واجب ہے۔

کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ تقلید کے منکر تھے؟

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تقلید کے منکر تھے، انتہائی درجہ جہالت کی بات ہے، کوئی غیر مقلد اس کو دلائل سے ثابت نہیں کر سکتا، ان کے فتاوی کی ۳۰/ سے زائد سبھی جلدیں گواہ ہیں کہ وہ شرعی و فقہی مسائل کے بیان میں ائمۂ اربعہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں اور ان کے مذہب پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ

کسی ایک مذہب کے مقلد نظر نہیں آتے، مگر مطلق تقلید کا انکار ان سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، فقہی مسائل میں عام طور پر وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک کا قول اختیار کرتے ہیں اور اس کا ان کو حق ہے، اس وجہ سے کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ وہ کسی ایک امام کی تقلید نہ کریں، البتہ چوں کہ وہ خود مجتہد مطلق نہیں تھے اس وجہ سے عام مسائل میں وہ اجتہاد سے بچتے تھے اور جہاں انہوں نے اجتہاد کرنے کی ہمت کی اُمّت مسلمہ نے ان کا اجتہاد رد کر دیا، مثلاً انہوں نے ائمۂ اربعہ کے خلاف یہ اجتہاد کیا کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار ہوگی تو اُمّت نے سوائے چند آزاد فکروں کے ان کا یہ اجتہاد رد کر دیا۔ اور علامہ ابنِ تیمیہ کا یہ قول شاذ قرار پایا۔ اسی طرح انہوں نے آنحضور ﷺ کے روضے مبارک کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو حرام قرار دیا تو اُمّت نے اس کو بھی رد کر دیا اور علامہ ابنِ تیمیہ کا یہ قول نہایت قبیح قول قرار پایا۔ (ارمغانِ حق)

تقلید اور تقلیدِ شخصی کا وجوب:

صاحبِ تحفۃ الالمعی فرماتے ہیں:

تقلید اور تقلیدِ شخصی کا وجوب بدیہی ہے یعنی یہ بات بے دلیل تسلیم کر لینی چاہئے۔ کیوں کہ یہ دونوں وجوب لذاتہٖ نہیں ہیں بلکہ لغیرہٖ ہیں۔ اور جو چیز لذاتہٖ واجب ہو اس کی دلیل کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے مگر جو چیز لغیرہٖ واجب ہو اس کی دلیل کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اس کے وجوب کا مدار اس غیر پر ہوتا ہے، اگر اس غیر میں کسی حکم کو واجب کرنے کی صلاحیت ہے تو فبہا ورنہ قصہ بالائے طاق! اسی طرح جو چیز لذاتہٖ ممنوع ہوتی ہے اس کی دلیل کا تو مطالبہ کر سکتے ہیں مگر جو چیز لغیرہٖ ممنوع ہوتی ہے اس کی دلیل مانگنا درست نہیں بلکہ اس غیر میں غور کرنا

چاہئے، اگراس غیر میں حرمت کی صلاحیت ہے تو فبہا ورنہ بات ختم! جیسے عورتوں کا نمازوں کے لیے مساجد میں جانا فی نفسہٖ ممنوع نہیں ہے۔ مسجدیں مردوں کی جاگیر نہیں ہیں، مساجد مسلمانوں کے لیے ہیں اور عورتیں بھی مسلمان ہیں۔ دورِ نبوی میں اور آج بھی حرمین میں سبھی عورتیں نماز کے لیے مسجد میں جاتی ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ فی حد ذاتہٖ کوئی ممانعت نہیں۔

البتہ عورتوں کا نماز کے لیے مساجد میں جانا فتنہ کا باعث ہے اور عورتوں کے بدلے ہوئے احوال کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کو گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے، ترمذی شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد آیا ہے کہ عورتوں کے یہ بدلے ہوئے حالات اگر نبیِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کے بعد عورتیں مسجدوں میں آتی تھیں پھر جب ان کے احوال بگڑے تو بعد کے انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو مسجدوں میں آنے سے روک دیا۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول پورا ہوا) اس ارشاد سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ ممانعت لغیرہٖ ہے۔

اور فتنہ کا مطلب یہ ہے کہ تین نمازیں اندھیرے میں آتی ہیں۔ مغرب پڑھ کر لوٹتے ہیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے، عشاء کی دونوں جانب اندھیرا ہے اور فجر کے لیے جب مسجد جاتے ہیں اس وقت اندھیرا ہوتا ہے، اور بعض عورتوں کے گھر مسجد سے فاصلہ پر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ہر نماز میں شوہر یا حرم مسجد میں لانے والا موجود نہیں ہوتا اور بجلی کا بھی ٹھکانہ نہیں رہتا اور آج کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے احوال لوگ جانتے ہیں۔ پس گھر اور مسجد کے درمیان آنے جانے میں فتنہ کا اندیشہ ہے، اس غیر کی وجہ سے عورتوں کو منع کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ تقلید بھی فی نفسہٖ واجب نہیں۔ کیوں کہ مجتہدین کے لیے تقلید ضروری نہیں بلکہ جائز بھی نہیں۔ حالاں کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ بلکہ تقلید کا وجوب لغیرہٖ ہے۔ اور وہ غیر دین سے واقف نہ ہونا ہے جب دین پر عمل واجب ہے اور ہر مسلمان دین سے واقف نہیں تو تقلید کے بغیر چارہ کیا ہے، اور اللہ کا ارشاد ہے: ﴿فَسۡـَٔلُوٓاْ أَهۡلَ ٱلذِّكۡرِ إِن كُنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ٧﴾ [الأنبياء: ٧] یعنی اگر تم دینی باتوں سے واقف نہیں ہو تو دین جاننے والوں سے پوچھو، اور وہ جو احکامِ شرعیہ بتائیں اس پر عمل کرو، یہی تقلید اور اتباع ہے۔

اسی طرح تقلیدِ شخصی یعنی کسی معین امام کی تقلید بھی فی نفسہٖ واجب نہیں بلکہ لغیرہٖ واجب ہے۔ دورِ اوّل میں یعنی صحابہ و تابعین کے زمانہ میں تقلیدِ شخصی نہیں تھی جو بھی عالم مل جاتا لوگ اس سے مسائل پوچھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اس لیے کہ اس زمانہ میں دلوں کے احوال درست تھے۔ لوگ اختلاف کی صورت میں احتیاط کا پہلو اپناتے تھے مگر بعد میں یہ صورتِ حال باقی نہ رہی۔ اب لوگ رخصتوں کے طلب گار ہیں اب اگر معین امام کی تقلید واجب نہیں قرار دی جائے گی تو تشّہی کا دروازہ کھل جائے گا۔ لوگ مجتہدین کی فقہوں میں سے رخصتیں ڈھونڈھیں گے جہاں سہولت کا قول ملے گا اس کو لے لیں گے پس یہ دین پر عمل کہاں ہوا یہ تو خواہش نفس کی پیروی ہوئی، اس غیر کی وجہ سے تقلیدِ شخصی کو واجب قرار دیا گیا ہے اس پر دلیل کا مطالبہ صحیح نہیں۔

علاوہ ازیں نفس تقلید کا وجوب بدیہی ہے کیوں کہ جب دنیا کا کوئی معاملہ تقلید کے بغیر انجام نہیں پاسکتا: کوئی سنار تقلید کے بغیر سنار نہیں بن سکتا، لوہار لوہار نہیں بن سکتا، سائنس دان سائنس دان نہیں بن سکتا، زندگی کی گاڑی اگلوں کی پیروی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں

بڑھ سکتی، بچہ باپ کی انگلی پکڑ کر ہی چلنا سکھتا ہے پھر دین کا معاملہ ہی ایسا غیر اہم کیوں ہے کہ ہر شخص جو چاہے کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین میں تقلید بہرحال کرنی ہے خواہ ائمہ حق کی تقلید کرو یا گمراہ لوگوں کی تقلید کرو، تقلید بہرحال ضروری ہے۔

تقلید ناگزیر ہے، تقلید کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی اور غیر مقلدین جو تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ بھی پکے مقلد ہیں۔ ہم ائمۂ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے مسائل پوچھتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ زوج مفقود و متعنت وغیرہ کے احکام حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے الحیلۃ الناجزۃ میں فقہِ مالکی سے لیے ہیں مگر کوئی غیر مقلد کسی حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں پوچھتا وہ اپنے مسلک کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے ہیں۔ پس وہ تقلید میں جامد ہیں۔

مذاہبِ اربعہ سب برحق ہیں:

غیر مقلدین لوگوں میں وسوسہ پیدا کرنے کے لیے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ چاروں مذہب حق کیسے ہوسکتے ہیں، حق تو ایک ہونا چاہئے، چاروں مذاہب میں مسائل کے درمیان بسا اوقات حلال و حرام کا اختلاف ہوتا ہے، جائز و ناجائز کا اختلاف ہوتا ہے تو دونوں طرح کے مسئلوں کو حق کیسے کہا جائے گا؟

یہ شبہ اس غلطی پر مبنی ہے کہ ان لوگوں نے حق کے معنی اور اس کی حقیقت پر غور نہیں کیا، اگر انہوں نے حق کے معنی میں اور اس کی حقیقت پر غور کرلیا ہوتا تو یہ شبہ پیدا نہ ہوتا۔ کلمہ حق کا اطلاق دو معنوں میں ہوتا ہے، کبھی تو حق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو بات واقع میں جیسی ہو اسی کے مطابق اگر کام ہوجائے یا کوئی خبر دے تو کام اور وہ خبر حق کہلاتی ہے، مثلاً کسی

نے کہا: فلاں جنگل میں آگ لگ گئی، فلاں آدمی نے زہر کھایا مگر مرا نہیں تو اگر ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے جیساکہ خبر دی تھی تو کہا جائے گا کہ خبر حق تھی۔

اسی طرح اگر کسی نے کہا میں جمعہ پڑھ کے آیا ہوں تو اگر اس نے واقعی جمعہ کے روز جمعہ پڑھا ہے تو اس کا یہ عمل حق ہوگا۔ حق کے اس معنی کی تعبیر عربی میں اس طرح کی جاتی ہے: الحق هو الأمر والكلام المطابق للواقع. یعنی کوئی بات یا کوئی حق واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

اور کسی خبر یا کسی کلام کے حق ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام یا خبر شریعت کے حکم اور قانون کے مطابق ہو، خواہ نفس الامر اور واقع اس کی موافقت کر رہا ہو یا نہیں، جو کام شریعت کے مطابق ہوگا وہ حق ہوگا واقع کے مطابق ہو یا غیر مطابق، یہاں واقع اور نفس الامر نہیں دیکھا جائے گا بلکہ قانون اور شریعت کو دیکھا جائے گا، مثلاً: شریعت کا حکم یہ ہے کہ قبلہ رُخ ہوکر نماز پڑھی جائے لیکن اگر کوئی مسافر صحرا اور بادیہ میں ہو اور اسے قبلہ پتہ نہ ہو تو شریعت کا حکم ایسے شخص کے لیے یہ ہے کہ سوچ بچار سے قبلہ کی سمت کا تعین کر کے نماز پڑھے، اب اگر اس کی نماز قبلہ رُخ نہ بھی ہو تو بھی اس کی نماز صحیح اور درست ہوگی، اس لیے کہ اس نے جو شریعت کا حکم تھا اسے پورا کیا، اس کے ذمہ قبلہ مشتبہ ہونے کی شکل میں تحری کرنا تھا سو اس نے تحری کر کے نماز پڑھی، اس لیے اگر اس کا رخ نماز میں قبلہ کی طرف نہیں بھی تھا تو بھی اس کی نماز شرعاً حق اور درست ہے۔

فضا میں بدلی ہے، رمضان یا عید کی رویت عام طور پر ثابت نہ ہو پائی، اب اگر دو آدمی شہادت دیں کہ چاند ہو گیا ہے، قاضی اور مفتی دیکھے گا کہ شہادت دینے والے شریعت کے

قانون شہادت پر پورے اتر رہے ہیں یا نہیں، اگر پورے اتریں گے تو وہ رویت کا فیصلہ کر دے گا، اور اگر ان کی شہادت شریعت کے معیار کے مطابق نہ ہوگی تو قاضی کا فیصلہ عدم رویت کا ہوگا اور یہی فیصلہ حق ہوگا، خواہ واقع اور نفس الامر میں چاند طلوع ہو گیا ہو۔

ایک جگہ شرعی شہادت فراہم ہوگئی، وہاں چاند کی رویت کا فیصلہ ہوگا اور دوسرے شہر میں چاند کی رویت کی شہادت حاصل نہ ہو سکی ہو، وہاں کا قاضی اور مفتی عدم رویت کا فیصلہ کرے گا اور دونوں فیصلے ایک دوسرے کی ضد اور خلاف ہونے کے باوجود حق ہوں گے اس لیے کہ دونوں فیصلے شریعت کے حکم کی روشنی میں ہے، آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔

ایک شخص نے زنا کیا اور واقعی زنا کیا مگر اس کے زنا پر چار شاہدوں کی شرعی شہادت مہیا نہ ہو سکی، اس پر حد زنا لاگو نہ ہوگی اور نہ اس کو از روئے قانون زانی کہنا درست ہوگا، بلکہ قاضی کے فیصلے کے بعد اس کو جو زانی کہے گا وہ مجرم ہے اور اس پر حد قذف جاری ہوگی۔ وہ نفس الامر اور واقع کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ شریعت کا حکم جاری ہوگا۔

چاروں مذاہب کو جو حق کہا جاتا ہے اس کی بنیاد بھی حق کے اسی دوسرے معنی پر ہے، مجتہد کے ذمہ شریعت نے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ مسائل شرعیہ کے حل کرنے میں اپنی اجتہادی صلاحیت سے کام لے، اب اگر اس کا اجتہاد درست سمت میں ہے تو وہ بھی حق ہے اور اگر اس نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کی غلطی بھی حق ہے اور اس غلطی پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اجر کا مستحق ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے اگر اجتہاد کرنے والے نے صواب (درستگی) کو پا لیا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہوگئی

توبھی ایک اجر کا وہ مستحق ہے، اگر مجتہد غلطی کرنے پر راہ حق و صواب سے شریعت کی نگاہ میں دور ہوتا تو شرعی طور پر وہ اجر کا مستحق کیوں ہوتا؟

یہی وجہ ہے اُمّت کا فیصلہ ہے کہ مذاہب اربعہ اور تمام مجتہدین اہلِ حق ہیں۔ ہر مجتہد مرضئ حق کا تابع ہوتا ہے، حکم شریعت کا پابند ہوتا ہے اس کا اجتہاد رضائے حق کے لیے ہوتا ہے اور شریعت کی اجازت اور حکم سے ہوتا ہے اس لیے ہر مجتہد بر حق اور اس کا فیصلہ حق ہوگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ اُمّت کا فیصلہ ہے کہ تمام مذاہب اربعہ اہلِ حق ہیں، کہیں یہ نہیں سنا گیا کہ کسی شافعی نے ابو حنیفہ کو کہا ہو کہ وہ حق پر نہیں تھے، کسی حنفی نے شافعی کو کہا ہو کہ وہ حق پر نہیں، سب حق پر تھے اور ان کے تمام اجتہادی مسائل بر حق ہیں۔

اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب تمام مذاہب ہی حق پر ہیں تو کسی ایک مذہب کی تقلید کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس لیے کہ کوئی بوالہوس دین اور شریعت کو کھیل نہ بنالے، یہ زمانہ تقوی اور دینداری کا نہیں ہے، اخلاص وللّٰہیت کا نہیں ہے، اگر عدم تقلید کی راہ کھول دی جائے اور ایک کی تقلید سے پابندی ختم کر دی جائے تو دین کا اہل اغراض اور اہل ھوا تماشا بنالیں گے، وقت ضرورت مخلصین للہ کو اجازت ہے کہ دوسرے مذہب پر بھی عمل کر سکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں، مگر یہ اجازت عام طور پر سب کو نہیں دی جا سکتی ہے۔(ارمغانِ حق ج۲، ص:۱٦٦)

مذہب امام ابی حنیفہؒ کو دنیا میں حسنِ قبول:

ابو حنیفہ کی فقہ کو دنیا میں جو حسنِ قبول حاصل ہوا وہ محتاجِ بیان نہیں، تیسری صدی سے

دنیائے اسلام میں اس کو عام مقبولیت حاصل ہونے لگی، اس کے بعد عموماً ہر زمانے میں حکومت اور عوام کی اکثریت کا مذہب یہی رہا، دنیائے اسلام کی دو ثلث آبادی اسی فقہ کی پیرو ہے۔

شیخ محمد طاہر پٹنی صاحب ؒ مجمع البحار (۹۸۶ھ) بحوالہ محدث کرمانی شافعی بخاریؒ (۷۸۶م) فرماتے ہیں:

فلو لم يكن لله سرٌّ خفيٌّ فيه لَمَا جمع له شطر الإسلام أو ما يقاربه على تقليده حتى عبد الله بفقهه و عمل برأيه إلى يومنا ما يقارب أربع ماءة و خمسين سنة و فيه أوّل دليل على صحته.

اگر اس مذہبِ حنفی میں اللہ تعالیٰ کی قبولیت کا راز پوشیدہ نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب مسلمان اس مذہب کے مقلد نہ ہوتے، ہمارے زمانے تک جس کو امام صاحب سے تقریبًا ساڑھے چار سو برس کا عرصہ کا ہوتا ہے ان کی فقہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو رہی ہے اور ان کی رائے پر عمل ہو رہا ہے، اس میں اس کی صحت کی اوّل درجہ کی دلیل ہے۔

ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴م) دسویں صدی کے آخر گیارہویں صدی کے شروع میں لکھے ہیں:

الحنفيّة ثلثَي المؤمنين. حنفیہ کل مسلمانوں کے دو تہائی ہیں۔

ممکن ہے کہ اب کچھ زیادہ ہی ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فقہِ حنفی کی مقبولیت کی وجہ اس کی یہ چند اہم خصوصتیں ہیں:

(۱) اس کے مسائل حکم و مصالح پر مبنی اور رعایتِ روایت کے ساتھ اصولِ درایت کے عین مطابق ہیں۔

(۲) فقہِ حنفی دوسری تمام فقہوں کی بہ نسبت نہایت آسان اور یسیر العمل ہے۔

(۳) فقہِ حنفی میں معاملات کے حصہ میں وسعت، استحکام اور باقاعدگی، جو تمدن کے لیے ضروری ہے تمام فقہوں سے زیادہ ہے۔

(۴) فقہِ حنفی نے غیر مسلم رعایا کو نہایت فیاض اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں، جس سے نظم مملکت میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

(۵) فقہِ حنفی کی سب بڑی خصوصیت اس فقہ میں شخصی آزادی کی رعایت ہے اور اس باب میں شاید کوئی اور فقہ اس کی ہمسر نہ ہو۔

(۶) فقہِ حنفی میں حقوق اللہ اور حلال و حرام میں احتیاط کی راہ اختیار کی گئی ہے۔

(۷) ایک خصوصیت یہ ہے کہ: فقہائے احناف نے دین کے اصولِ مسلّمہ اور قواعدِ متفقہ نیز عقل سے ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا ہے، یعنی عقل اور اصول دونوں کی رعایت کی گئی ہے، مثلاً شریعت کی ایک تسلیم شدہ اصل یہ ہے کہ انسانی جسم پاک ہے اور اس کا چھونا موجبِ نجاست نہیں، یہ عین مطابق عقل و دانش بھی ہے چنانچہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے شرم گاہ یا عورتوں کے چھونے کو ناقضِ وضو قرار نہیں دیا۔

(۸) فقہِ حنفی کا ایک بڑا احسان "فقہِ تقدیری" ہے۔ فقہِ تقدیری سے مراد یہ ہے کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے ہی ممکن الوقوع مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے۔

(۹) ایک خصوصیت "حِیَل" ہے۔ حِیَل حیلہ کی جمع ہے، حیلہ کے اصل معنی معاملات کی تدبیر میں مہارت کے ہیں، شریعت کی اصطلاح میں حرمت و معصیت سے بچنے کے لیے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

افسوس کہ حیل کا یہ فن جو احناف کے کمالِ ذکاوت، اُمّت کو حرام سے بچانے کی سعی اور شریعت کی حدودِ اربعہ میں رہتے ہوئے انسانیت کو حرج سے بچانے کے محمود جذبات کا عکاس تھا، اُمّت کے ایک طبقہ کے طعن کا باعث بن گیا۔ حضرت سرخسیؒ فرماتے ہیں: ”حاصل یہ ہے وہ حیل جن کے ذریعہ انسان حرام سے خلاصی یا حلال تک رسائی کا خواہاں ہو بہتر ہے، ہاں! کسی کے حق کا ابطال یا باطل کی ملمع سازی مقصود ہو تو ناپسندیدہ ہے۔“ (تاریخ تدوینِ فقہ/فقہ اسلامی تدوین و تعارف)

فقہِ حنفی کی حقیقت:

سلف میں علمائے اُمّت کی دو قسمیں تھیں، ایک تو حفّاظِ حدیث کی جنہوں نے احادیثِ نبویہ کی رعایت اور حفاظت کی، دوسری قسم فقہائے اسلام کی ہے، جن کے اقوال پر مخلوق میں فتوے کا دارو مدار ہے یہ گروہ استنباطِ احکام کے ساتھ مخصوص رہا، انہوں نے قواعد حلال و حرام کے ضبط کا قیام کیا۔

مشہور تابعی مسروق کا قول ہے کہ میں صحابہ کی صحبت میں رہا، ان کے علوم کے مجموعہ یہ صحابہ تھے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اور ان کے جامع حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما تھے۔ کوفہ میں علم دین کی اشاعت حضرت علقمہ، حضرت اسود، حضرت عمرو بن شرحبیل اور حضرت شریح جیسے کبار تابعین سے ہوئی اور یہ تمام حضرات حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے۔ اس طبقہ کے بعد ان کے تلامذہ ابراھیم نخعی، شعبی، ابن جبیر وغیرہ ہوئے ان کے بعد حمّاد بن ابی سلیمان، سلیمان بن المعتمر، سلیمان الاعمش

اور مسعر بن کدام ہوئے، ان کے بعد شریک، محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلی، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ ہوئے، ان کے بعد اصحاب ابی حنیفہؒ مثلاً حفص بن غیاث، وکیع، ابویوسف، زفر، حمّاد بن ابی حنیفہؒ، حسن بن زیاد اور محمد رحمہم اللہ تعالیٰ علوم کے وارث ہوئے اور اسی روشنی میں فقہِ حنفی کی تاسیس ہوئی۔

تفصیل مندرجہ بالا سے معلوم ہوا کہ دین کا وہ اہم علم جس کی ترویج و اشاعت کا اتباع اکابرِ صحابہ نے کتاب اللہ کے بعد اُس زمانہ میں کیا جب کہ روایتِ حدیث قلیل تھی بلکہ روایت سے لوگ روکے جاتے تھے، خلفاء راشدین کا زمانہ جس علم کے اہتمام میں ختم ہوگیا تھا، بسلسلہ امام ابوحنیفہ کو پہنچا، بالخصوص باب العلم حضرت علیؓ اور مُلِیٔ علما وحکمۃ حضرت ابن مسعودؓ کا وہ علم جو ۲۳؍ برس کی صحبت اور قربِ خاص میں ان دونوں کو بارگاہ نبوت سے براہِ راست حاصل ہوا تھا، اور جو بالآخر تمام صحابہ کے علوم کا مجموعہ تھا، چار پشت تک کبار تابعین کے سینوں سے گزر کر امام ابوحنیفہ کو پہنچا، ان کی اور ان کے تلامذہ کی کوششوں نے علم مدون اور مرتب کرکے ایسا آئینِ شریعت ملک وملت کے سامنے رکھ دیا جو حق اور ہدایت کی قوت سے دنیائے اسلام کی عبادت و معاملات کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنے اور دنیائے اسلام میں پھیلنے کے لیے تیار اور آمادہ تھا۔ صحابہ کے اسی مجموعۂ علوم کا نام جو چار پشتوں تک اجلۂ تابعین کے سینوں میں محفوظ رہا، مدون ہوکر ''فقہِ حنفی'' ہے، بلا شبہہ یہ فقہ ایک عالم کے لیے یہ سرمایۂ اعمالِ حسنہ اور اس کے عاجز بندوں کے لیے وسیلۂ عظمیٰ ہے۔

(تاریخ علمِ فقہ، تدوینِ فقہ تعارف)

ائمۂ اربعہ کا طرزِ استدلال اور متعارض اَدلہ میں ترجیح کا طریقۂ کار:

(۱)ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کی بنیاد قرآن حکیم اور عراق کے مروّج و معمول بہٖ احادیث پر زیادہ رکھی، اس کے بعد قیاس و استحسان سے بہت زیادہ کام لیا۔ مختلف دلائل کے درجات و مراتب کی رعایت اور ان میں غایت درجہ توازن واعتدال فقہِ حنفی کا نمایاں وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ ”کتاب اللہ“ کی اوّلیت اور اس کی بالاتری کا یہاں قدم بہ قدم پر لحاظ رکھا جاتا ہے، حدیث سورہ فاتحہ کو نماز کے لیے ضروری قرار دیتی ہے، قرآن کہتا ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو سکوت اور گوش برآواز رہنا ضروری ہے، اور قرآن میں یہ بھی ہے: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ [المزمل:۲۰] تم پڑھو قرآن میں سے جو آسان ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے مطلق قرأت کو فرض، سورہ فاتحہ کو واجب قرار دیا لیکن اقتداء کر رہا ہو تو کہا کہ امام کی قرأت اصالۃً اپنی طرف سے اور نیابۃً اپنے مقتدیوں کی طرف سے ہے لہٰذا مقتدی خاموش رہے گا۔(مَن كان له إمامٌ فقراءة الإمام له قراءة.)

خود ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو ان کا طریقۂ اجتہاد منقول ہے وہ اس طرح ہے:

”میں اوّلاً کتاب اللہ پر، پھر سنّتِ رسول پر، پھر خلفائے اربعہ کے فیصلہ جات پر اس کے بعد دوسرے صحابہ کے فیصلوں پر عمل کرتا ہوں، اگر صحابہ میں اختلاف ہوتا ہے تو قیاس سے کام لیتا ہوں۔“

نیز صحابہ کے درمیان اختلاف کی صورت میں بھی آپ نے فرمایا ”انہی میں سے کسی ایک کو اختیار کرتا ہوں، ہاں جب معاملہ تابعین تک آتا ہے میں بھی انہیں کی طرح اجتہاد کرتا

ہوں"۔"وما جاءنا عن أصحابه تخيرنا و ما جاءنا عن غيرهم منهم رجال و نحن رجال."

"و يقدم قول الصحابى على القياس": اصل میں فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جن مسائل میں قیاس و اجتہاد کی گنجائش نہیں ان میں صحابہ کی رائے "حدیثِ رسول" کے درجہ میں ہوگی، کیوں کہ ضروری ہے کہ ان حضرات نے آپ ﷺ سے سن کر یا آپ کو دیکھ کر ہی رائے قائم کی ہوگی چنانچہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن، حضرت انس اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہما ہی کی آراء پر مقرر کی ہے۔

"و يقدم المُرسل على القياس": حدیثِ مرسل یعنی وہ حدیث جس کو تابعی نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہو اور درمیانی واسطہ یعنی صحابی کا ذکر نہیں کیا ہو، بعض حضرات کے یہاں مقبول نہ ہے۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض خاص شرطوں اور تفصیلات کے ساتھ مرسل روایات کو بھی قبول کیا ہے۔ اس طرح جہاں مرسل پر عمل کر کے احناف نے روایات کے ایک قابلِ لحاظ حصہ پر عمل کیا ہے، وہیں بعض احتیاطی شرطیں بھی عائد کر کے اس بات کا اطمینان بھی کر لیا کہ غیر مقبول راویوں کی روایت پایۂ اعتبار حاصل نہ کر لے۔

(۲) اسی طرح مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ حکیم، حجاز کی مروّج احادیث و آثار، تعاملِ اہلِ مدینہ اور قیاس و استصلاح کو اپنی فقہ کی اصل قرار دی ہے۔

استصلاح: شریعت اور مصالح کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے فقہائے مالکیہ کے ایک اہم اصل "مصالحِ مرسلہ" ہے جس کو "استصلاح" بھی کہا جاتا ہے۔ مصالحِ مرسلہ

سے مراد یہ ہے کہ ایسی مصلحتیں کہ شریعت نے نہ ان کے معتبر ہونے کی صراحت کی ہے اور نہ نفی، ان کا اعتبار کیا جائے۔ در اصل فقہائے مالکیہ کا تصور یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح انسانی ہی پر مبنی ہیں، اس لیے مصالح کو حکم کی بنیاد بنانا شریعت کے اس مزاج و مذاق کے عین مطابق ہے۔ احناف ان احکام کو ''استحسان'' کے زمرہ میں رکھتے ہیں۔

تعاملِ اہلِ مدینہ: فقہِ مالکی کی ایک خاص اصل ہے، جس کے لیے مالکیہ بہت مشہور ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ فقہِ مالکی میں اوّل درجہ متّصل یا مرسل حدیث کو حاصل ہے اس کے بعد حضرت عمر کے فیصلہ جات، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فتاوی اس کے بعد دوسری مدنی صحابہ کے فتاوی کا درجہ ہے، اس کے بعد مدینہ منورہ کے مشہور اصحابِ افتاء سعید بن مسیب، عمرو بن زبیر، قاسم، سالم، سلیمان بن یسار، ابو سلمہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، ابوبکر بن عمرو بن حزم، اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمھم اللہ تعالیٰ کے فتاوی کو اہمیت حاصل ہے۔

(۳) اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قرآنِ حکیم کے ظاہر اور صحیح ترین احادیثِ اہلِ حجاز و اہلِ عراق اور پھر اجماع و قیاس سب سے یکساں کام لیا، تعامل مدینہ اور استحسان سے علاحدہ رہے۔ اجتہاد و تفقہ کے لحاظ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر تین دور گذرے ہیں۔

بغداد میں قیام کرنے کے بعد مکہ کو واپسی اور نو سال تک یہاں قیام، غالبًا اسی زمانہ میں آپ نے فتوی دینا شروع کر دیا تھا، امام شافعیؒ اس عہد میں فقہ حجازی کے زبردست مؤید اور فقہ عراقی کے ناقد نظر آتے ہیں۔ ۱۹۵ھ میں آپ دوبارہ بغداد تشریف لے گئے اور تین سال تک وہیں مقیم رہے اور اس درمیان بغداد میں آپ کا فیضانِ علم جاری رہا، اس قیام نے بہت سے

مسائل میں امام شافعیؒ کو نظر ثانی کا موقع فراہم کیا اور بہت سے احکام میں فقہاءِ عراق کی آراء نے آپ کو متاثر کیا، پھر ۱۹۹ھ میں آپ بغداد سے مصر تشریف لے گئے اور تقریبًا چار سال وہاں مقیم رہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصر میں آپ نے اپنی آراء اور اجتہادات پر مکمل نظر ثانی فرمائی اور بے شمار مسائل میں اپنی سابقہ رائے سے رجوع فرمایا، ان ہی تبدیل شدہ آراء کو امام شافعی کا قول جدید قرار دیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کا زمانہ وہ تھا جب عالمِ اسلام پر مختلف گمراہ فرقوں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور کتاب و سنّت ان کا تختۂ مشق بنے تھے۔ خبرِ واحد کے انکار کے علاوہ ان کا طریقہ خاص نصوص کی دور از کار تاویلات، بعید از عقل و لغت توجیہات اور ظاہری معنی سے گریز و انحراف تھا، امام شافعیؒ کو اس فتنہ کی نزاکت اور اسکے دور رس اثرات و نتائج کا اندازہ تھا، اس لیے جہاں ایک طرف آپ نے حدیث اور خصوصیت سے خبرِ واحد کی حجیت پر قوی اور مضبوط دلائل قائم کئے وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ حتی الامکان نصوص کے ظاہری اور متبادر معنی ہی مراد لیے جائیں۔

(۴) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فقہ کی بنیاد قرآنِ کریم اور ظاہر حدیثِ نبویہ اور آثارِ صحابہ پر رکھی، تعاملِ اہلِ مدینہ اور قیاس سے بہت کم کام لیا۔ علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں، امام احمد کے ہاں کتاب و سنّت کی نصوص کو اوّلیت حاصل ہے، نصوص کے مقابلہ بہ شمول آثار صحابہ کے آپ کسی رائے کو خاطر میں نہیں لاتے، نصوص کے بعد امام احمدؒ کے ہاں صحابہ کے فتاویٰ کو خاص اہتمام اور اعتناء حاصل ہے۔

صحابہؓ کے فتاویٰ نہ ہوں تو پھر حدیث مرسل اور حدیثِ ضعیف پر عمل کرتے ہیں، بشرطیکہ اس مسئلہ میں اس کے خلاف کوئی دلیل موجود نہ ہو، امام احمدؒ کے ہاں آخری درجہ

قیاس کا ہے، جہاں نہ نص ہو نہ صحابی کا متفق علیہ یا مختلف فیہ فتوی، نہ حدیثِ مرسل ہو اور نہ ضعیف حدیث ہو وہاں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔

اتباعِ سنّت سے غایتِ اعتناء اور ورع و احتیاط نیز بعض معاصر فرقِ باطلہ سے قیاس میں غلو نے آپ کو قیاس کے معاملہ میں خاصا محتاط بنا دیا تھا، اور اس لیے آپ بہ کثرت فرمایا کرتے تھے: ''ضعیف حدیث بھی میرے نزدیک رائے سے بہتر ہے''۔ ''ضعيف الحديث أحبُّ إلينا من رأي الرجال''.

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی فقہ کو زندہ رکھنے اور ہر دم رواں اور دواں زندگی سے مربوط کرنے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ غیر منصوص مسائل میں قیاس کا دروازہ کھولا جائے، اس لیے آپ کے متبعین نے قیاس سے کام لینے میں پوری فیاضی برتی۔ فقہِ حنبلی کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حنابلہ کے یہاں احکام کے استخراج اور استنباط میں علت سے زیادہ حکمت اور شریعت کی اصل روح کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، فقہِ حنبلی میں ایک فقہی ماخذ ''استصحاب'' ہے۔ استصحاب یہ ہے کہ زمانۂ ماضی میں جو چیز ثابت ہو، مستقبل میں بھی اس کو ثابت مانا جائے۔ جیسے ایک شخص پاک ہو اور اس کو پاکی کی حالت میں نہ ہونے کا شک ہو تو جب تک حدث کی کوئی دلیل موجود نہ ہو وہ طہارت کی حالت میں سمجھا جائے گا۔

فقہِ حنبلی میں مختلف اقوال و آراء کے سلسلہ میں تین اصطلاحات ہیں:

(۱) روایات (۲) تمویہات (۳) اوجہ۔ جو اقوال امام احمدؒ کی طرف منسوب ہوں، خواہ متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ ''روایات'' کہلاتے ہیں، جو اقوال صریحاً امام احمدؒ کی طرف منسوب نہ ہوں لیکن امام کی بعض آراء سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں آپ کی رائے یوں تھی، وہ

''تمویہات'' ہیں۔ مجتہدین فی المذاہب جو امام صاحب سے غیر منقول احکام میں اجتہاد کر کے رائے قائم کرتے ہیں ان کی آراء کو ''اوجہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (فقہِ اسلامی تدوین و تعارف از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب)

امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر اور ان کے مذہب پر بعض اعتراضات اور ان کے جوابات:

بعض حلقوں میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مذہب پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ حقیقتِ حال سے جاہل ہو کر اعتراض کرتے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں جو دل کے اندرونی اسباب کی وجہ سے طعن کرتے ہیں، جنہیں اللہ ہی جانتا ہے۔ بلکہ آج ہم عوام کی زبان سے اس جلیل القدر امام کے بارے میں ایسے جملے سنتے ہیں کہ جن سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل دہل جاتے ہیں۔

لہٰذا اب ہم امام اور ان کے مذہب پر کیے گئے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کرتے ہیں، تاکہ جو شخص حقیقت جاننا چاہے اس پر حقیقت واضح ہو جائے، اور جسے جہالت اور بدفہمی نے مبتلا کیا ہے وہ آگاہ ہو جائے، اور حسد و عناد رکھنے والوں پر بھی حجت پوری ہو جائے۔

عبداللہ بن داود کا قول ہے: امام ابو حنیفہ پر کلام نہیں کرتا مگر دو میں سے ایک شخص: یا وہ شخص جو ان کے علم سے حسد کرتا ہے۔ یا وہ جاہل جو ان کی قدر و منزلت کو نہیں جانتا۔

پہلا طعن: کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ حدیث نہیں جانتے تھے، اور اس دعویٰ پر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان سے بہت کم روایات منقول ہیں۔

جواب:

بتوفیقِ الٰہی ہم کہتے ہیں، کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ باوجود اپنے وسیع فقہی کمالات کے، حدیث کے بھی بڑے حفاظ میں سے تھے اور لوگوں میں سب سے زیادہ اس کے جامع تھے۔ انہوں نے حدیث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ جس کا احاطہ وہی کر سکتا ہے جو ان کے مرتبہ کا ہو۔ متقدمین و متاخرین ائمہ نے امام ابو حنیفہؒ کی حدیث میں امامت کی شہادت دی ہے، اور بہت سے جلیل القدر محدثین نے اس پر صراحت کی ہے۔ اس پر سب کا اجماع اس بات کا واضح ثبوت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ فقہ میں مجتہد امام تھے۔

موفق مکیؒ نے مناقب میں حسن بن زیادؒ سے نقل کیا ہے: ابو حنیفہؒ چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے؛ ان میں سے دو ہزار حمّاد سے اور دو ہزار دوسرے مشائخ سے۔

حفاظِ حدیث کا کلام بھی اس طعن کی تردید کرتا ہے؛ حاکم نیشاپوری نے معرفۃ علوم الحدیث میں یوں فرمایا:

علوم حدیث کے انچاسویں قسم میں: "یہ اس نوع کا بیان ہے کہ ان ائمہ ثقات کو پہچانا جائے جو تابعین اور تبع تابعین میں سے تھے، جن کی احادیث کو حفظ و مذاکرہ اور برکت کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے، اور جن کا ذکر مشرق سے مغرب تک کیا جاتا ہے"؛ پھر انہوں نے مختلف شہروں کے اکابر کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

"اہلِ کوفہ میں سے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ، داود بن نصیر طائیؒ، زفر بن ہذیلؒ اور عافیہ بن یزید قاضیؒ ہیں۔"

امام ابنِ تیمیہؒ نے منہاج السنہ میں فرمایا: "ائمۂ اہلِ حدیث، تفسیر، تصوف اور فقہ؛ جیسے چاروں ائمہ اور ان کے متبعین۔"

ابن القیم الجوزیہ حنبلیؒ نے اعلام الموقعین میں فرمایا:

”جہاں تک صحابہ، تابعین اور ائمۂ حدیث جیسے امام شافعیؒ، امام احمدؒ، مالک، امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام بخاریؒ، امام اسحاقؒ وغیرہ کا طریقہ ہے۔“

اسرائیل بن یونسؒ نے کہا:

نعمان (یعنی امام ابوحنیفہ) کیا ہی بہتر شخص تھے، کتنے زیادہ حافظ تھے ہر اُس حدیث کے جو فقہ سے تعلق رکھتی، اور اس بارے میں کتنی سخت جستجو کرتے۔ بلکہ وہ امام ناقد حدیث تھے، جرح و تعدیل کے ماہر تھے، اور ان کے بارے میں اہلِ فن کے علمانے ویسے ہی اخذ کیا جیسے امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام یحییٰ بن معین جیسے اکابر ائمہ سے اخذ کیا۔ اور علماء نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر بطور احتجاج اور اعتبار کے کیا ہے۔ اور امام کا کلام جرح و تعدیل کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

علامہ عبد الرشید نعمانیؒ نے مقامِ امام ابوحنیفہ فی الحدیث میں، حفاظ کے اقوال ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

یہ جلیل القدر ائمہ اور نقد کے ماہرین؛ ابوداود، ترمذی، حاکم، بیہقی، ابن عبدالبر، ابنِ تیمیہ، ابن القیم، ابن کثیر سب نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ امام ابوحنیفہ ائمۂ حدیث میں سے ہیں، جن کے اقوال جرح و تعدیل، تصحیح و تعلیل میں معتبر ہیں، جیسے باقی حفاظ نقاد ائمہ محدثین کے اقوال معتبر ہیں۔ قدیم و جدید محدثین اور حفاظ نے بالاتفاق ان کی مہارت، حفظ، اتقان اور روایت میں ورع کا اعتراف کیا ہے۔

پھر مزید فرمایا:

یہ بات کسی صاحبِ فہم سے مخفی نہیں رہ سکتی کہ فقہ اور اجتہاد کا دروازہ علومِ قرآن،

حدیث، آثارِ صحابہ، اقوالِ تابعین، ان کے اختلافات اور قرآن و سنّت کے ناسخ و منسوخ کے علم کے بغیر نہیں کھلتا۔ جب محدثین نے امام ابو حنیفہؒ کے فقہ کو تسلیم کیا بلکہ انہیں سب سے بڑا فقیہ مانا اور ان کے مجتہد امام ہونے کا اعتراف کیا، تو انہوں نے یہ بھی مان لیا کہ وہ احادیث کے حافظ، ان میں ماہر اور اس علم میں متقن تھے۔

صاحبِ جامع المسانیدؒ نے کہا:

کہا گیا ہے: امام ابو حنیفہؒ کے مسائل پانچ لاکھ تک پہنچتے تھے۔ اور ان کی اور ان کے شاگردوں کی کتابیں اس پر شاہدِ عادل ہیں۔

حالاتِ زمانہ اور ضرورتِ وقت کی طرف آپ کی توجہ:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایتِ احادیث اگرچہ دوسرے محدثین کے مقابلے میں کم ہے، لیکن ان کی قلت سے ان کے مقام و مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہ لازم نہیں آتا کہ روایتیں کم ہونے کی وجہ سے وہ حدیث میں کم مرتبہ رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کرنے کے بعد اپنا پہلا مقصد یہ بنایا کہ اللہ کے کلام، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابۂ کرام و تابعین رضی اللہ عنہم کے آثار کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہ ان لوگوں کی پہنچ میں آجائیں جو خود استنباط اور استخراج کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی لیے آپ نے فقہِ متین کی تدوین اور دینِ اسلام کے احکام کے استنباط میں بھرپور جدوجہد کی۔ اس وقت اُمّت کو اس کی سخت ضرورت تھی کیوں کہ اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو چکی تھی، لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، دینِ اسلام دنیا پر غالب ہو رہا تھا، اور روز بروز نئے مسائل اور نئے حالات پیدا ہو رہے تھے۔ نصوصِ شرعیہ ہر سوال کا براہِ

راست جواب نہیں دیتی تھیں اور ہر شخص نصوص سے براہِ راست استنباط کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے محض الفاظ حدیث کے جمع کرنے کے مقابلے میں نصوص کو حالات پر منطبق کرنے اور ان سے احکام نکال کر مسائل کا حل پیش کرنے کی ضرورت زیادہ تھی۔

دوسری طرف ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جو احادیث کے الفاظ کی حفاظت، ان کے جمع کرنے اور روایت کرنے میں خوب محنت کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ساری ہمّت فقہ کی تدوین، احادیث کو انسانی زندگی پر منطبق کرنے اور ان سے احکام مستنبط کرنے پر صرف کی۔ آپ نے اس کے لیے اصول طے کیے اور ان پر فروع مرتب کیں۔ اس طرح آپ دونوں میدانوں (حدیث اور فقہ) کے جامع اور گویا دو سمندروں کے سنگم بن گئے۔ جیسا کہ سلیمان الاعمش نے امام صاحب سے کہا تھا:

"اے فقہاء کی جماعت! ہم (محدثین) صرف دوائی بیچنے والے ہیں اور تم طبیب ہو، اور تم اے ابو حنیفہ! تم نے دونوں کو جمع کر لیا ہے۔" یعنی حدیث اور فقہ۔

اسی کام میں آپ کے ساتھ ہر فن کے ماہر شریک ہوئے، جیسے: عبداللہ بن المبارکؒ اور مکّی بن ابراہیمؒ اور یحییٰ بن سعید قطّانؒ جو حدیث میں پیش رو تھے، فضیل بن عیاضؒ جو زہد و ورع میں ممتاز تھے، ابو یوسف یعقوبؒ جو اخبار میں ماہر تھے، زفر بن ہذیلؒ جو قیاس میں نمایاں تھے، محمد بن حسن الشیبانیؒ جو فطانت، نحو، اعراب اور حساب میں کمال رکھتے تھے، حسن بن زیادؒ جو سوال و تفریع میں ممتاز تھے۔

پھر محدثین کی تعداد جماعت میں زیادہ تھی اور انہی سے جَوامع، سُنن اور مسانید کے مصنفین نے روایت کی۔ یہ سب ایک کھلی دلیل ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان سب کے استاد

اور تمام علوم کے جامع تھے۔ وہ قرآن، حدیث، اور علومِ عربیہ سب میں ماہر اور فاضل تھے، اسی وجہ سے ایسے جلیل القدر ائمہ نے ان سے تلمذ کیا۔

ابن حجرؒ نے الخیرات الحسان میں فرمایا:

خبر دار یہ گمان نہ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ کو فقہ کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت نہ تھی، ہر گز نہیں! وہ تفسیر، حدیث، علومِ ادبیہ اور حکمت وقیاس میں ایک بے پایاں سمندر تھے، ایسے امام تھے جن سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ابنِ خلدونؒ لکھتے ہیں:

کچھ بدخواہ اور متعصب لوگ مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "ان ائمہ مجتہدین میں سے بعض ایسے بھی تھے جو حدیث کے علم میں کم مایہ تھے۔" لیکن بڑے ائمہ کے بارے میں یہ گمان ہر گز درست نہیں ہو سکتا، کیوں کہ شریعت تو کتاب وسنّت ہی سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور جو شخص حدیث میں کم مایہ ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ حدیث کو تلاش کرے، اس کی روایت کرے اور اس میں پوری جدوجہد کرے، تاکہ دین کو درست بنیادوں سے حاصل کرے اور احکام کو براہِ راست اس ہستی سے لے جو ان کو پہنچانے والا ہے۔

البتہ بعض ائمہ کی روایات کم ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ حدیث سے بے پروا تھے، بلکہ اس لیے کہ ان کی روایت پر بعض اعتراضات وارد ہوتے تھے یا ان کی اسناد میں کچھ علتیں پائی جاتی تھیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی روایتِ حدیث کم ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھوں نے روایت اور تحملِ حدیث کے شرائط میں سختی کی۔ وہ اس حدیث کو ضعیف شمار کرتے تھے جو یقین کے درجہ پر نہ

ہو یا جب اس کے خلاف کوئی عملی ثبوت موجود ہو۔ اسی وجہ سے ان کی روایتیں کم ہوگئیں۔ یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر حدیث کو چھوڑ دیا، ایسا کہنا ان کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس اس بات کی دلیل کہ وہ حدیث کے بڑے مجتہد تھے، یہ ہے کہ ان کا مذہب اہلِ علم کے درمیان معتبر سمجھا جاتا ہے، قبول و رد میں اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ البتہ دوسرے محدثین نے روایت کے شرائط میں کچھ نرمی برتی، اس لیے ان کی احادیث زیادہ ہو گئیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے بعد ان کے شاگردوں نے بھی ان شرائط میں وسعت پیدا کی، تو ان کی روایات زیادہ ہوگئیں۔

اعتراضِ ثانی:

یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ حدیث کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ علمِ حدیث کی زیادہ پروا نہیں کرتے اور نصوص کے مقابلے میں قیاس کو مقدم رکھتے ہیں۔

جواب: کسی عامی مسلمان کے بارے میں، جو اللہ عزوجل سے ڈرتا ہو، یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی حدیث کے خلاف عمل کرے جب کہ وہ اس کے نزدیک ثابت اور رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر منقول ہو۔ پھر امام جلیل امام ابو حنیفہؒ، کے بارے میں تو بدرجہ اوّلیٰ ایسا گمان درست نہیں۔ ہاں! بظاہر ایسا لگتا ہے کہ امام نے کسی حدیث کے خلاف کیا اور قیاس کو اختیار کیا، لیکن اگر ہم مسئلہ کی گہرائی میں جائیں اور باب میں وارد تمام روایات پر غور کریں تو حقیقت دن کی طرح روشن ہوجائے گی اور یہ واضح ہوگا کہ امام نے ہرگز حدیث کے خلاف نہیں کیا۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے اپنی گراں قدر رسالہ ''رفع الملام عن الأئمة الأعلام'' میں فرمایا:

یہ بات جان لینی چاہیے کہ جن ائمہ کو اُمّت نے عام طور پر قبول کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی قصداً رسول اللہ ﷺ کی کسی سنّت کی مخالفت نہیں کرتا، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ وہ سب اس پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع واجب ہے، اور یہ کہ ہر شخص کی بات لی بھی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی ہے، سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔ ہاں! اگر کسی امام کا کوئی قول ملے جو کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو، تو ضرور اس کے پاس اس حدیث کو ترک کرنے کا کوئی عذر ہو گا۔

پھر انہوں نے دس وجوہات بیان کیں جن کی وجہ سے کسی مجتہد سے حدیثِ رسول ﷺ کا ترک صادر ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا:

یہ دسوں وجوہات بالکل واضح ہیں، اور بہت سی احادیث میں ممکن ہے کہ عالم کے پاس کوئی ایسی حجت ہو جس کی بنیاد پر وہ حدیث پر عمل نہیں کرتا، جو ہم تک نہیں پہنچی۔ کیوں کہ علم کے خزانے وسیع ہیں اور ہم سب علماء کے دلوں کے اندرونی اسباب تک نہیں پہنچ سکتے۔ کبھی عالم اپنی دلیل ظاہر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا، اور اگر ظاہر کرے بھی تو ممکن ہے وہ دلیل ہم تک نہ پہنچے، اور اگر پہنچ بھی جائے تو ہم اس کے استدلال کا پہلو نہ سمجھ سکیں۔

اور اپنی کتاب منهاج السنة النبوية میں فرمایا:

یہ اہلِ علم وہ لوگ ہیں جو دن رات علم کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا کسی سے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ کبھی کسی صحابی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور کبھی دوسرے صحابی کے قول کو، جیسا کہ انہیں شرعی دلائل سے راجح معلوم ہوتا ہے۔

پھر انھوں نے علماء کی طبقات بیان کیے اور پانچویں طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اس میں ابراہیم نخعی، امام ابو حنیفہ، ابن ابی لیلیٰ، شریک، وکیع بن جراح، ابو یوسف، محمد بن حسن اور ان جیسے دیگر علماء شامل ہیں۔ رحمهم الله

ابنِ حجر مکی شافعیؒ نے اپنی کتاب الخیرات الحسان میں لکھتے ہیں:

تم پر لازم ہے کہ جو کچھ علماء نے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں کہا ہے کہ وہ اہل الرائے ہیں، اسے یہ نہ سمجھو کہ اس سے ان کی تنقیص مقصود ہے، یا یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنّت یا صحابۂ کرام کے اقوال پر اپنے رائے کو مقدم کرتے ہیں؛ بلکہ وہ اس سے بالکل بری ہیں۔

امام سیوطیؒ نے تاریخ بخاری سے نعیم بن عمر کا قول نقل کیا: میں نے امام ابو حنیفہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ میں رائے سے فتویٰ دیتا ہوں، حالاں کہ میں تو صرف اثر (حدیث) ہی سے فتویٰ دیتا ہوں۔

اور امام ابو جعفرؒ نے اپنی سند کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

خدا کی قسم! جس نے یہ کہا کہ ہم نص کے مقابلے میں قیاس کو مقدم کرتے ہیں اس نے جھوٹ کہا اور ہم پر بہتان باندھا۔ بھلا نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی کیا حاجت ہے؟ ہم قیاس تو صرف اس وقت کرتے ہیں جب سخت ضرورت پیش آجائے۔ اس لیے کہ ہم سب سے پہلے کتاب اللہ، سنّت رسول، اور صحابۂ کرام کے فیصلوں میں دلیل تلاش کرتے ہیں۔ اگر ان میں دلیل نہ پائیں تو پھر ہم مسکوت عنہ مسئلہ کو منصوص مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں، دونوں کے درمیان پائے جانے والے اتحاد (اتحادِ علت) کی بنا پر۔

امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اِعلام الموقعین میں فرمایا:

امام ابو حنیفہؒ کے تمام اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ حدیث (خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو) ان کے نزدیک قیاس اور رائے پر مقدم ہے۔

البتہ یہاں ضعیف سے مراد وہ ضعیف نہیں جو متاخرین کے اصطلاح میں ہے، بلکہ وہ جو متاخرین کے نزدیک حسن کہلاتی ہے اسے متقدمین بسا اوقات ضعیف کہا کرتے تھے۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے روایت کیا ہے کہ:

نعمان بن ثابت (امام ابو حنیفہؒ) دانش مند، عالم اور اپنے علم میں متثبت (پختہ) تھے، جب ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث صحیح طور پر ثابت ہو جاتی تو وہ اسے چھوڑ کر کسی اور چیز کی طرف نہیں جاتے۔

مقدمۂ اعلاء السنن میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کسی حدیث کو درج ذیل وجوہات کی بنا پر ترک کرتے ہیں:

(ا) کبھی وہ اس لیے حدیث کو چھوڑ دیتے کہ وہ ان کے نزدیک ثابت اور صحیح نہیں ہوتی، جیسے انہوں نے حدیثِ ابی عیاش کو رد کیا۔ بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے صحیح حدیث رد کر دی، مگر یہ اعتراض حقیقت میں اعتراض نہیں ہے؛ کیوں کہ حدیث کی صحت ایک اجتہادی امر ہے۔ کسی حدیث کو اس کی سند میں طعن کی وجہ سے رد کرنا صرف امام ابو حنیفہ کا طریقہ نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو نقدِ حدیث میں مشغول ہوا ہے اس کا یہی طریقہ رہا ہے۔ یہ بات ہر اس شخص پر ظاہر ہے جس نے کتبِ حدیث میں ذرا بھی نظر ڈالی ہے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کے بارے میں محدثین نے تصحیح و تضعیف میں اختلاف کیا ہے۔ امام

صاحب ناقدِ حدیث اور جرح و تعدیل کے ماہر تھے، اس لیے ان کا قول تصحیح، تضعیف، قبول اور رد میں معتبر ہے۔

(۲) کبھی وہ حدیث کو اس لیے چھوڑ دیتے کہ اس کے معارض کوئی دوسری حدیث یا دوسری قوی اور راجح دلیل ان کے سامنے ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس معارضے ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ان پر طعن کرتا ہے کہ انھوں نے حدیث کے خلاف کیا، یا پھر وہ شخص ترجیح کے طریقے کو نہیں مانتا اور مخالفت کا الزام دیتا ہے۔ یہ دونوں طعن فاسد ہیں؛ کیوں کہ یہ مخالفت حدیث نہیں بلکہ اجتہاد کا اختلاف ہے۔

(۳) کبھی وہ حدیث کو اس لیے ترک کرتے کہ ان کے نزدیک وہ منسوخ ہوتی ہے اور اس کی نسخ کا ثبوت کسی دلیل سے ہوتا ہے، جب کہ دوسرا شخص اس نسخ کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کے طریقۂ استدلال کو نہیں مانتا اور ان پر طعن کرتا ہے کہ انھوں نے حدیث کی مخالفت کی۔ یہ بھی حقیقت میں مخالفت نہیں بلکہ اجتہاد کا اختلاف ہے۔

فقہائے کوفہ کو "صاحب الرائے" کہنے کا مسئلہ:

اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نصوص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں تو یہ بات کسی طرح تسلیم نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ پہلے وضاحت کی جاچکی ہے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قیاس اور رائے سے بھی استمداد کرتے تھے تو اس میں کوئی طعن اور برائی نہیں؛ کیوں کہ قیاس شریعت کی حجتوں میں سے ایک حجت ہے، جس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے، جیسا کہ اصولِ فقہ میں طے شدہ ہے۔

لفظ "رائے" جو اس نسبت میں ہے، دراصل یہ حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ سے ماخوذ

ہے جو اجتہاد کی حجیت کی اصل ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا: أجتهد برأيي (میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا)۔

اور یہاں ''رائے'' سے مراد قیاس ہے منصوص کا غیر منصوص پر۔

شیخ محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ نے ''أصول الإفتاء'' میں فرمایا:

بعض لوگوں کا یہ گمان کہ ''اصحاب الرائے'' صرف حنفیہ ہیں، درست نہیں؛ کیوں کہ یہ لقب ان تمام فقہاء کے لیے تھا جنہوں نے اپنے آپ کو احکامِ شرعیہ کے استنباط کے لیے وقف کر دیا تھا یا فروعی مسائل کی تفصیل و تفریع میں زیادہ مشغول کر رکھا تھا۔ اسی لیے حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اپنی شرحِ مؤطا کا نام رکھا: الاستذكار لما تضمنه الموطأ من معاني الرأي والآثار اور ابنِ قتیبہ نے اپنی کتاب ''المعارف'' میں ''باب ذكر أصحاب الرائی'' قائم کیا ہے، اور ان میں ابنِ ابی لیلی، امام ابوحنیفہ، ربیعۃ الرائے، امام مالک بن انس، سفیان ثوری، امام اوزاعی اور اُمّت کے دیگر بڑے علماء کو شمار کیا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

ایسا لگتا ہے کہ فقہائے احناف نے فروعی مسائل کی تفصیل میں جو وسعت اختیار کی، اس کی وجہ سے بعد کے ادوار میں یہ لقب خاص طور پر انہی کے ساتھ منسوب ہو گیا۔ لیکن جن لوگوں نے دلائلِ حنفیہ میں گہرائی سے غور نہیں کیا اور ان کے بعض مسائل کو بظاہر اپنی پہنچ تک موجود احادیث کے خلاف پایا، اور ساتھ ہی وہ ان احادیث پر متوجہ نہ ہو سکے جن سے احناف نے استدلال کیا تھا، تو انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ سب محض ''رائے مجرد'' پر مبنی ہیں۔ پھر یہ بات لوگوں میں مشہور ہو گئی، حتیٰ کہ بعض مخلص محدثین بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے صرف حنفیہ ہی کو ''اصحاب الرائے'' کا لقب دینا شروع کر دیا اور اس پر ان پر نکیر بھی کی۔

اور حق بات وہی ہے جو سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی نے ''شرح مختصر الروضۃ'' میں کہی:

اصحاب الرائے اضافت کے اعتبار سے وہ سب ہیں جو احکام میں رائے کا استعمال کریں، تو یہ تعریف تمام علماء اسلام کو شامل ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی مجتہد اپنے اجتہاد میں نظر و رائے سے بے نیاز نہیں ہوتا، خواہ وہ ''تحقیق المناط'' اور ''تنقیح المناط'' ہی کیوں نہ ہو، جس کی صحت پر کسی کا اختلاف نہیں۔ اور جہاں تک اس لقب کے بطورِ عَلَم استعمال کا تعلق ہے تو سلف کے عرف میں یہ اہلِ عراق کے لیے بولا جاتا تھا، اور وہ اہلِ کوفہ تھے: امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین۔ ان پر سلف کے بعض ائمہ کی طرف سے بہت زیادہ طعن کیا گیا، یہاں تک کہ اس میں حد سے بڑھ گئے۔ دل ان باتوں کے ذکر کرنے کو گوارا نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے چاہا ہی نہیں کہ امام کو ان تہمتوں میں ڈال دیا جائے؛ بلکہ اس نے انہیں ان نسبتوں سے پاک رکھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ہرگز عناد کی بنا پر سنّت کی مخالفت نہیں کی، بلکہ جہاں مخالفت دکھائی دیتی ہے، وہاں اجتہاد کی بنیاد پر کی، اور ان کی حجتیں واضح اور دلائل روشن ہیں، جو آج بھی لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔ ان دلائل کا منصفانہ جواب ان کے مخالفین سے شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ پس اگر خطا کی تو انہیں ایک اجر ہے، اور اگر درست ٹھہرے تو دو اجر ہیں۔ اور ان پر طعن کرنے والے یا تو حسد کرنے والے تھے یا اجتہاد کے مواقع کو نہ سمجھنے والے جاہل تھے۔

تیسرا اعتراض:

یہ ہے کہ جو احادیث امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی تائید میں بیان کی جاتی ہیں وہ سب یا زیادہ تر ضعیف ہیں۔

جواب: اس اعتراض کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے:

(۱) ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حنفیہ کے دلائل سب ضعیف ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر یا تو صحیح ہیں یا حسن۔ جیسا کہ "نصب الرایہ" اور دیگر وہ کتابیں جو ان کے دلائل کو تخریج کے ساتھ جمع کرتی ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ اور اگر کچھ روایات ضعیف ہوں تو بھی بعض قرائن کی وجہ سے وہ احتجاج کے قابل درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

(۲) اصولِ حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی مجتہد کا حدیث سے استدلال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے نزدیک وہ حدیث صحیح ہے۔ لہٰذا اگر کوئی امام کسی حدیث سے استدلال کرتا ہے تو یہ اس حدیث کی صحت کی بہترین شہادت ہے۔ اور پہلے ذکر ہو چکا کہ حدیث کی تصحیح اور تضعیف ایک اجتہادی امر ہے، جو ظنی اصولوں پر مبنی ہے جن میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایک ہی حدیث امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حجت ہو اور دوسرے کے نزدیک نہ ہو، یا برعکس۔

(۳) بعض اوقات کوئی روایت امام ابو حنیفہؒ کے دور میں حجت کے لائق تھی، کیوں کہ وہ ان تک ایسے طریقے سے پہنچی تھی جو ضعف کے اسباب سے پاک تھا، لیکن بعد میں جب وہ روایت دوسرے رواۃ کے ذریعے محدثین تک پہنچی تو ان کے سبب اس میں ضعف یا نقص پیدا ہو گیا۔

یہاں ایک اور شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ حنفیہ کی کتابوں میں جو احادیث درج ہیں ان کی اسانید موجود نہیں، لہٰذا وہ ضعیف یا موضوع ہیں۔

اس اشکال کا ازالہ شیخ قاسم بن قُطلُوبُغَا نے اپنی کتاب منیۃ الالمعي میں کیا ہے، جہاں وہ لکھتے ہیں:

ہمارے متقدمین علماء اپنی فقہی مسائل اور ان کے دلائلِ احادیث کو اپنی اسانید کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ مثلاً امام ابویوسفؒ نے اپنی کتاب ''الخراج'' اور ''الأمالي'' میں، اور امام محمدؒ نے ''الأصل'' اور ''السیر'' میں۔ اسی طرح امام طحاویؒ، خصافؒ، رازیؒ اور کرخیؒ نے بھی (اسانید کے ساتھ) نقل کیا ہے، سوائے بعض کتب کے جیسے ''المنتصرات''۔ پھر بعد میں آنے والے حضرات نے انہی متقدمین کی کتب پر اعتماد کیا اور ان سے احادیث نقل کیں لیکن ان کے اسانید یا مخرج ذکر نہ کیے، پھر لوگ انہی کتابوں پر موقوف ہوگئے اور انہی پر اعتماد کرلیا۔

پس اس عبارت سے ظاہر ہوا کہ متقدمین کی کتابوں میں احادیث اپنی اسناد کے ساتھ ذکر کی جاتی تھیں، لیکن بعد والوں نے سہولت اور اختصار کے پیشِ نظر ان اسناد کو حذف کردیا اور انہی پر اعتماد کیا۔ اسی طرح وہ مصادر و مراجع جن پر بڑے فقہاء نے احادیث کے نقل کرنے میں اعتماد کیا تھا، اُس وقت سب کے لیے عام طور پر دستیاب تھے، لیکن زمانے کے گزرنے، فتنوں کے ظہور اور تاتاریوں کے حملوں کی وجہ سے بہت سے نادر خزانے مٹ گئے۔

چوتھا اعتراض:

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے پہلے کچھ اقوال اختیار کیے پھر بعد میں اُن سے رجوع کرلیا۔

وہ لوگ اس رجوع کو امام پر طعن کا ذریعہ بناتے ہیں، حالاں کہ یہ طعن کی وجہ نہیں، بلکہ کسی قول سے اس وقت رجوع کرنا جب اس کی خطا ظاہر ہوجائے، یہ صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حق کی پیروی کی توفیق دی ہو۔ اور غلطی پر ڈٹے رہنے سے ہزار گنا

بہتر ہے کہ انسان حق ظاہر ہونے پر اُس کی طرف پلٹ آئے۔ یہی ہر فقیہ اور مجتہد کا طریقہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی مسئلہ ایسا بچا ہو جس میں اُن کا ایک قدیم اور ایک جدید قول نہ ہو۔ یہ بات اُن کے تقویٰ، دیانت اور حق کو ترجیح دینے کی روشن دلیل ہے۔

الغرض بیمار دلوں کی یہ کوشش کہ امام ابو حنیفہؒ کی عظمت کو چھوٹا کر کے دکھائیں اور اُن کی فضیلت کو گھٹا کر بیان کریں، یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا انجام قابلِ تعریف نہیں۔ وہ امام، جس کی اتباع اُمّتِ محمدیہؐ کے نصف حصے نے کی ہے اور جس کی عظمت و فضیلت پر اجماعِ اُمّت منعقد ہوا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا، افسوس کہ آج ہر بے علم و بے وقعت شخص اُن پر طعن و تشنیع کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے: امام کے پاس تو چند احادیث کے سوا کچھ نہیں تھا، اور کوئی کہتا ہے: وہ شریعت سے صرف رائے اور قیاس ہی کو جانتے تھے۔ اس طرح کے اقوال سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں اُن کی قدر و منزلت اور بلند مقام کو واضح کرنے کے لیے چند نمونے ذکر کیے۔

یحییٰ بن معین جب سنتے کہ کوئی امام ابو حنیفہؒ کے خلاف بات کر رہا ہے تو فرمایا کرتے:

حسدوا الفتى إذ لم ينالوا فالناس أعداء له وخصوم

كضرائر الحسناء قلن لوجهها حسدا وبغيا إنه لدميم

یعنی دراصل امام کے مخالفین حسد، دشمنی اور ضد کی بنا پر کہتے تھے کہ وہ عیب دار ہیں۔

اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جو شخص امام ابو حنیفہؒ کی اس بے نظیر شخصیت کو صحیح طور پر پیش کرے اور حق کو اجاگر کرے، اُسے تعصب اور غلو کا الزام دے دیا جاتا ہے۔

فالحدیث ذو شجون، وإلی الله المشتکی، وإنا لله وإنا إلیه راجعون

اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا اور اُس کی پیروی کی توفیق عطا فرما، اور باطل کو باطل دکھا اور اُس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اللہ تعالیٰ درود و سلام نازل فرمائے ہمارے سردار حضرت محمد مصطفی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر، آپ کی آل اور صحابۂ کرام پر۔

(ماخوذ از مقدمہ بر ہدایہ مطبوعہ المکتبۃ البشریٰ)

والحمد لله رب العالمين

چند اہم فوائد:

ذیل میں چند اہم فقہی فوائد تحریر کیے جاتے ہیں جن کو جان لینے سے طالب علم کو فقہ میں مہارت بھی ہوگی فقہی کتابیں سمجھنا آسان اور سہل بھی ہوں گی اور بہت سے خلجان بھی دور ہوں گے۔

فقہاء کے طبقے ومدارج:

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح عقود رسم المفتی میں ذکر کیا ہے کہ فقہائے حنفیہ کے مختلف طبقات (درجے ومراتب) ہیں علامہ ابن کمال پاشاؒ نے ان کو سات طبقات میں منحصر کیا ہے۔

(۱) مجتہد فی الشرع: وہ فقہائے کرام جنھوں نے اصولِ اجتہاد وضع کیے اور ان اصول کی روشنی میں غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کیے، جیسے: امام ابوحنیفہ، امام مالک، اماشافعی، امام احمد وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم۔

(۲) مجتہد فی المذہب: جو خود کسی فقہی مسلک کے بانی نہیں ہیں، ائمۂ اربعہ میں کسی

ایک امام کے مقلد ہیں۔ یہ اپنے امام کے اصول کے پابند ہوتے ہیں، مجتهد فی المذہب جانتا ہے کہ امام کے اصول کیا ہیں اور اس نے کن اصول پر اپنے مذہب (فقہی مسلک) کی بنیاد رکھی ہے، چنانچہ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس میں امام کی نص موجود نہ ہو تو وہ اس میں اس امام کے اصول کے مطابق اجتہاد کرتا ہے اور امام کے اقوال سے اسی طریقے کے مطابق اس کی تخریج کرتا ہے، لیکن اپنے امام کے وضع کردہ اصول و قواعد و ضوابط سے باہر نہیں جاتا جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ۔

(۳) مجتہد فی المسائل: اصول اور مبادی میں اپنے امام سے اتفاق رکھتے ہوں البتہ بعض فروعی مسائل میں اپنے امام کے اجتہاد سے اختلاف رکھتے ہوں، جیسے: مذہبِ حنفی میں امام طحاوی، سرخسی، بزدوی اور مذہبِ شافعی میں سے امام غزالی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

(۴) اصحابِ تخریج: یہ مقلد ہوتے ہیں، صاحبِ مذہب یا ان کے کسی شاگرد سے کوئی ایسا قول منقول ہو جو مجمل یا دو وجہین ہو یا کسی حکم میں دو احتمال ہوں تو اپنی خداداد صلاحیتوں سے اصول کے پیشِ نظر، نظائر و امثال پر قیاس کر کے تفصیل و تعیین کرتے ہیں جیسے امام کرخی، جصاص رازی رحمہما اللہ تعالیٰ۔ ہدایہ کے بعض مقامات پر جو یہ الفاظ آئے ہیں کذافی تخریج کرخی اور تخریج الرازی وہ اسی قسم میں سے ہے۔

(۵) اصحاب الترجیح: اس طبقہ کے فقہاء کا کام یہ ہے کہ وہ مذہب کی بعض روایات کو دوسری بعض روایات پر اپنے قول: هٰذا أولىٰ، هٰذا أصح، هٰذا أوضح وأظهر وغیرہ کلمات کے ذریعہ ترجیح دیتے ہیں، جیسے: ابوالحسین قدروی اور صاحبِ ہدایہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ طبقہ بھی مقلدین کا ہے جو اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۶) مقلدین اصحابِ تمیز: ان حضرات کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مذہب کی مضبوط اور

کمزور روایات میں فرق وامتیاز کرتے ہیں۔ اکثر اصحاب متون اسی طبقہ سے وابستہ ہیں مثلاً صاحبِ کنز، صاحب وقایہ، صاحب مختار وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ حضرات اپنی تصینفات میں مردود اور غیر مقبول اقوال نقل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

(۷)غیر ممیز مقلد: جو حضرات گذشتہ طبقات میں سے کسی بھی ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں انھیں ساتویں طبقہ میں رکھا جاتا ہے در حقیقت یہ لوگ فقیہ نہیں بلکہ محض ناقل فتاوی ہیں آج کل اکثر مفتیان کرام کا تعلق اس طبقہ سے ہے اس لیے اس طبقہ کے لوگوں پر پوری احتیاط لازم ہے جب تک مسائل منقح نہ ہوں اس وقت تک انھیں جواب دینے سے گریز کرنا چاہیے۔

نوٹ: مذکورہ بالا طبقات فقہاء کو بہت سے متاخرین نے لیا ہے اور بغیر کسی اعتراض اور احتیاط کے ویسے ہی ذکر کردیے ہیں، جیسے: علّامہ ابنِ کمال پاشا نے ذکر کیے تھے لیکن بعد میں آنے والے بہت سے گہرا علم رکھنے والے علماء نے اس پر تنقید کی ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے اصول الافتا، وآدابہ: ۹۳ اور فتاوی نویس کے رہنما اصول: ۱۵۰)

الألفاظ الدالة على الترجيح والتصحيح:

صریح ترجیح وتصحیح کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ تمام درجہ اور قوت کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ قوت رکھتے ہیں۔

ان الفاظ میں سب سے زیادہ قوی "علیه عمل الأُمّة" ہے پھر علیه الفتوی اور به یفتی، پھر الفتوی علیه، پھر والصحیح، پھر والأصح، پھر باقی تمام الفاظ قوت تصحیح کے اعتبار سے برابر ہیں، جیسے: هوالمعتمد، وهو الأشبه، به نأخذ، علیه فتوی مشائخنا، هو الأوجه، هو

الأظہر وغیرہ۔ یہ الفاظ قوتِ تصحیح میں برابر ہیں البتہ ان کے اسمِ تفضیل کے صیغے دیگر صیغوں کی نسبت راجح ہوں گے۔

فائدہ: صحیح اور اصح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ ان میں سے کونسا زیادہ قوی ہے بعض فقہاء نے فرمایا اصح بنسبت صحیح کے زیادہ قوت رکھتا ہے، کیوں کہ یہ اسمِ تفضیل ہے۔ دیگر حضرات کہتے ہیں صحیح کا لفظ اصح سے قوی تر ہے۔ کیوں کہ صحیح کا مقابل لفظ خطا ہے اور اصح کا مقابل صحیح ہے تو جس لفظ کا مقابل خطا ہوگا اس میں زیادہ تاکید ہوگی بنسبت اس کے جس کا مقابل صحیح ہے۔

اس بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اگر اصح اور اور صحیح دونوں کا کہنے والا ایک ہی شخص ہو تو بالاتفاق اصح ہی صحیح پر مقدم ہوگا اور اگر ان دونوں لفظوں کے قائل الگ ہوں تو پھر وہ اختلاف ہوگا جو ابھی ذکر کر دیا گیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو ہر مقام پر لاگو نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اصح جیسے صحیح کے مقابلے میں آتا ہے ویسے کبھی اس کو خطا کے مقابلے میں بھی استعمال کرتے ہیں پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں تین قول ہوتے ہیں وہاں صحیح کا لفظ اس تیسرے قول کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جو خطا ہوتا ہے اور پھر اصح کا لفظ اس قول کے مقابلے میں لایا جاتا ہے جس کے لیے صحیح کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، اب جس قول کو صحیح کہا گیا وہ تیسرے قول کے مقابلے میں (جو خطا ہے) تو راجح ہوگا لیکن قول اصح کے مقابلے راجح نہیں ہوگا۔ لہٰذا زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ سیاق کلام میں غور کیا جائے اور اس کے ذریعہ کہنے والے کی مراد تک پہنچا جائے نہ یہ کہ اصح اور صحیح میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر ہر جگہ اس قاعدہ کو بنا کر لاگو کر دیا جائے۔

پھر یہ پوری تفصیل تب ہے جب یہ الفاظ مختلف اقوال کے لیے استعمال ہوں لیکن اگر جب لفظ اصح ایک تصحیح کو دوسری تصحیح پر ترجیح دینے کے لیے استعمال ہو تو پھر بلا شبہ اصح ہی صحیح پر راجح ہے۔ (فتوی تعارف، اصول وآداب ۲۱۵)

طبقات المسائل الحنفية:

حنفیہ نے جس طرح فقہاء کو مختلف طبقات پر تقسیم کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مسائل کو بھی مختلف درجات میں تقسیم کیا ہے، تاکہ تعارض کے وقت مفتی اعلیٰ درجہ کے مسائل کو اختیار کرے اور راجح قول پر مرجوح قول کو ترجیح دینے کی غلطی نہ کرے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی اور شرح مقدمہ الدر المختار میں ذکر فرمایا ہے کہ ہمارے ائمہ حنفیہ کے مسائل کے تین طبقات ہیں۔

(۱) مسائل الاصول: ان کا نام ظاہر الروایۃ بھی ہے۔ اور یہ مسائل ائمۂ مذہب یعنی امام ابوحنفیہ، امام ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہیں۔ ان حضرات کو ائمۂ ثلاثہ حنفیہ بھی کہا جاتا ہے۔ امام زفرؒ اور حسن بن زیادؒ اور دیگر وہ تمام حضرات جنھوں نے امام ابوحنیفہؒ سے فقہ حاصل کی ہے وہ بھی ائمۂ مذہب میں شامل ہیں لیکن عام طور پر ظاہر الروایۃ کہتے وقت یہی مراد ہے کہ وہ ائمہ ثلاثہؒ کا یا ان میں سے بعض کا قول ہے۔

یہ مسائل جنھیں "ظاہر الروایۃ" اور "اصول" کا نام دیا گیا ہے، یہ وہ ہیں جو امام محمدؒ کی مندرجہ ذیل چھ کتابوں میں موجود ہیں: المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر۔

ان کتابوں کو ظاہر الروایۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ امام محمدؒ سے ثقہ راویوں کے واسطہ سے بدرجۂ تواتر یا بدرجۂ شہرت منقول ہیں۔

(۲) مسائل النوادر: ان کا نام نوادرالروایۃ بھی ہے یہ وہ مسائل ہیں جو انہی ائمہ سے منقول ہیں لیکن یہ سابقہ کتابوں میں موجود نہیں ہیں بلکہ یا تو یہ مسائل امام محمد کی دیگر کتابوں میں ہیں جسے کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات اور رقیات، ان کتابوں کو غیر ظاہر الروایہ کہا گیا کیوں کہ یہ کتابیں پہلی چھ کتابوں کی طرح امام محمد سے واضح، ثابت اور صحیح روایات کے ساتھ ثابت نہیں یعنی ان کی سند ظاہر الروایہ کی طرح مشہور و معروف نہیں ہے۔ اس طبقہ کی روایتوں کا درجہ ظاھر الروایہ سے کمتر ہوتا ہے۔

یہ مسائل امام محمد کے علاوہ دیگر حضرات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں جیسے: حسن بن زیاد کی "کتاب المجرد" امام ابو یوسف کی "کتاب الامالی" اسی طرح یہ مسائل بعض دیگر روایات سے بھی مروی ہیں جیسے ابن سماعہ اور معلی بن منصور وغیرھما کی بعض متعیّن مسائل میں روایات۔

فقہائے حنفیہ کے نزدیک اصل قاعدہ جس پر عمل کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا اور اگر نوادرالروایہ، ظاھر الروایہ سے متعارض ہوئی تو ظاھر الروایہ ہی کو ترجیح ہوگی الا یہ کہ مشائخ ظاہر الروایہ کو ترک کرنے کا فیصلہ کرلیں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی روایات میں سے اس روایات کو اختیار کیا جائے گا جو حدیث پاک سے زیادہ قریب ہو خواہ وہ روایات نادرہ میں سے ہو یا امام ابو حنیفہؒ کی مشہور روایات کے علاوہ ہو۔

علامہ ابنِ عابدینؒ فرماتے ہیں: وہ مسائل جو ایسی کتابوں میں ہیں جنھیں امام محمدؒ سے مشہور روایات کے ساتھ نقل کیا گیا ہے تو انہی مسائل پر فتویٰ دیا جائے گا اگرچہ فقہاء حنفیہ نے

ان کی تصحیح صراحتًا نہ کی ہو۔ہاں اگر فقہاء حنفیہ نے کتب ظاہر الروایہ کے علاوہ کسی اور روایات کی تصحیح کردی تو ان کی تصحیح شدہ روایت کی پیروی کی جائے گی۔

(۳) مسائل الفتاویٰ والواقعات: وہ مسائل جن کے متعلق ظاہر الروایہ اور نادر الروایہ میں متقدمین اہل مذہب سے کوئی حکم شرعی منقول نہ ہو اور بعد کے مشائخ و مفتیان نے مجتہدین کے اصول کی روشنی میں ان کا استنباط واستخراج کیا ہو ایسے مسائل کو اصطلاح میں فتاویٰ وواقعات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ حضرات (یعنی بعد کے مشائخ احناف) امام ابو یوسف "اور امام محمد" کے شاگرد ہیں اور ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ان حضرات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جیسے: عصام بن یوسف، ابن رستم، محمد بن سماعہ، ابو سلیمان جوزجانی، ابو حفص بخاری اور ان کے بعد والے حضرات، جیسے محمد بن سلمہ، محمد بن مقاتل، نصیب بن یحییٰ، ابو النصر قاسم بن سلام ہیں۔ یہ حضرات کبھی کبھی عرف وضرورت کو دیکھتے ہوئے مذہب کی صریح روایت کے خلاف بھی فتویٰ دیتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے رسالہ عِقد الجيد فی أحكام الاجتهاد والتقليد میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: محققین فقہاء کے نزدیک مسائل احناف کل چار قسموں پر مشتمل ہیں۔

(۱) ظاہرِ مذہب: وہ مسائل ہیں جو ظاہر الروایہ میں ثابت ہو چکے ہیں اور ان مسائل کا حکم یہ ہے کہ فقہاء ان کو ہر حال میں قبول کرتے ہیں خواہ اصول کے موافق ہوں یا مخالف۔

(۲) روایاتِ شاذہ: یعنی وہ مسائل جو اصحابِ مذہب (الامام وصاحبیہ) سے شاذ روایتوں کے واسطہ سے منقول ہیں ان روایتوں کو فقہا اس وقت قبول کرتے جب کہ وہ ظاہر مذہب

کے موافق ہوں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہدایہ اور اس جیسی دیگر کتابوں میں کتنے مقامات ایسے ہیں جہاں دلیل کی قوت کی بنا پر بعض روایات شاذہ کی تصحیح کی گئی ہے۔

(۳) تخریجاتِ متاخرین: متاخرین کی وہ تخریج ہے جس پر جمہور اصحابِ حنفیہ متفق ہوں اور اس کا حکم یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ ہر حالت میں اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔

(۴) تخریجاتِ متاخرین (مختلف فیہ): متاخرین کی وہ تخریج ہے جس پر جمہور اصحابِ حنفیہ کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ مفتی اس تخریج کو اصول سے اور سلف کے کلام میں سے اس سے ملتے جلتے مسائل سے موازنہ کرے گا اگر یہ تخریج اس نے اصول و نظائر کے موافق پائی تو اس کو لے لے گا ورنہ تخریج کو چھوڑ دے گا۔

حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے اپنے رسالہ النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ کتب فقہ میں مذکورہ جزئیات پانچ طبقوں پر منقسم ہیں:

(۱) ادلۂ اربعہ کے پوری طرح موافق مسائل: یعنی ایسی جزئیات جو کتاب و سنّت، اجماع اور ائمہ کے بیان کردہ قیاس کے موافق ہوں اور ان کے خلاف کوئی نصِ شرعی یا دلیلِ شرعی موجود نہ ہو۔

(۲) اکثر یا اقوی ادلہ کے موافق مسائل: یعنی ایسے مسائل جو کسی دلیل شرعی سے ماخوذ ہوں لیکن ان کے مقابلہ میں کوئی دوسری شرعی دلیل بھی موجود ہو اور دلیل مخالف ماخوذ عنہ دلیل سے کمتر درجہ کی ہو یا اپنے اندر اس کے مقابلہ میں کچھ خفا رکھتی ہو۔ مذکورہ بالا دونوں طرح کے مسائل یقیناً قابل قبول ہوں گے۔

(۳) متعارض ادلہ سے ماخوذ مسائل: اس طبقہ کا اطلاق ان مسائل و جزئیات پر ہوتا ہے جو بعض دلائلِ شرعیہ سے مستنبط ہوں لیکن ان کے مقابلہ میں صحیح اور قوی دلائل بھی

پائے جاتے ہوں، ایسے مسائل میں مجتہد غور وفکر کرکے کسی ایک جانب کو راجح قرار دے دے گا اور غیر مجتہد اپنے سے اوپر کے مجتہد یا فقہاء کا اتباع کرے گا۔

(۴) مخالف شرع صرف قیاسی مسائل: یعنی ایسے مسائل جو قیاس سے نکالے گئے ہیں حالاں کہ قیاس سے اوپر درجہ کی کوئی معتبر دلیل اس حکم کے خلاف موجود ہے تو ایسی صورت میں قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا اور شرعی دلیل پر عمل کیا جائے گا۔

(۵) غیر مدلل مسائل: یعنی ایسی جزئیات جو کسی بھی شرعی دلیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ بعض متاخرین نے انھیں ویسے ہی مسائلِ مذہب میں شامل کر دیا اس طرح کے مسائل کا ترک بلکہ ان کی تردید ضروری ہے۔

واضح رہے کہ علامہ لکھنویؒ نے مذکورہ بالا طبقات بیان کرکے فقہِ حنفیؒ پہ زبان طعن دراز کرنے والوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی ہے اگر بالفرض کتب فقہ میں ایسا کوئی مسئلہ خلاف نص آگیا ہے تو اس میں اصحابِ مذہب کا قصور نہیں بلکہ بعض متاخرین کی غلطی سے ایسا ہوا ہے اور ایسے مسائل میں حکم یہی ہے کہ دلیل شرعی پر ہی عمل ہو گا۔

تنبیہ: امام محمدؒ کی مزید تین کتابیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بعض مؤلفین نے لکھا ہے کہ ان کو پہلی قسم یعنی کتاب ظاہر الروایہ کے ساتھ ملحق کرنا ممکن ہے کیوں کہ یہ تینوں کتابیں مشہور بھی ہیں اور اہم بھی وہ تین یہ ہیں: (۱) موطا امام محمد (۲) کتاب الآثار (۳) کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ۔

ظاہر یہ ہے کہ اگرچہ یہ تینوں کتابیں امام محمدؒ کی طرف نسبت کے صحیح ہونے اور اہلِ علم کے درمیان مشہور ہونے کے اعتبار سے کتبِ ظاہر الراویہ کے درجے کی ہیں، لیکن یہ کتابیں

مذہب کے بیان اور اس کے فروعات کو بیان کے لیے بنیادی طور پر نہیں لکھی گئیں ان میں سے پہلی دو کتابیں ان کا موضوع تو احادیث و آثار ہیں اور ان میں جو فقہی مسائل آئے ہیں وہ صرف تابع ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں۔ اور تیسری کتاب تو اس کا موضوع اختلافِ ائمہ کے مسائل ہیں۔ جب کہ کتبِ ظاہر الروایہ تو بنیادی طور پر ان کی وضع ہی بیان مذہب کے لیے ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ کتبِ ظاہر الروایہ ہی مذہبِ حنفی کی معرفت کے لیے قابل اعتماد ہوں گی۔

شاید اسی وجہ سے فقہائے احناف نے ان تینوں کتابوں کو نہ تو ظاہر الروایہ میں ذکر کیا ہے اور نہ ہی نوادر میں۔ یہ کتابیں نوادر میں اس لیے نہیں ہیں کہ یہ امام محمد سے درجہ شہرت تک پہنچی ہوئی ہیں اور ظاہر الروایہ میں اس لیے نہیں ہیں کہ ان کی تصنیف بیان مذہب کے لیے نہیں ہوئی۔ بظاہر ان تینوں کا مرتبہ نوادر سے بلند ہے اور ان میں جو مسائل ہیں ان پر عمل کیا جائیگا، سوائے اس صورت کے کہ جب ظاہر الروایہ کی چھ کتابوں سے ان کا تعارض آجائے۔ (فتاوی تعارف، اصول وآداب، فتاوی نویسی کے رہنما اصول)

چند ضروری اصطلاحات

نصوص کی چار قسمیں:

فرض، واجب، سنّت، مستحب، حرام، مکروہ وغیرہ ان احکام کو ثابت کرنے کے لیے ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نصوص کی چار قسمیں کی ہیں۔ اور یہ تقسیم دو لحاظ سے ہے: (۱) ثبوت کے لحاظ سے اور (۲) معنی مرادی پر دلالت کے لحاظ سے۔

(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ: یعنی اس کا ثبوت یقینی ہو اور قطعی الدلالۃ اس کے معنی

بھی یقینی ہو کسی دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو، جیسے: قرآن کی محکم آیات، ان کا ثبوت بھی قطعی ہے کیوں کہ تواتر سے ثابت ہے اور معنی بھی متعیّن ہے دوسرے معنی کا احتمال نہیں ہے۔

(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ: جیسے کہ آیات متشابہات کہ ثبوت قطعی ہے مگر بہت سے معانی کا احتمال ہے لہٰذا ان کی دلالت کسی ایک معنیٰ پر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے۔

(۳) ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ: جیسے محکم خبرِ واحد، خبرِ واحد ہونے کی وجہ سے وہ ظنی الثبوت ہے اور محکم یعنی ایک معنی متعیّن ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے۔

(۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ: جیسے محتمل اخبارِ آحاد اور ثبوت بھی ظنی اور اس کے معنی پر دلالت بھی غیر متعیّن اور ظنی ہے۔

پہلی صورت میں اگر نصوص میں امر کا صیغہ ہو تو اس سے فرضیت کا ثبوت ہوگا اور نہی کا صیغہ ہو تو حرمت کا ثبوت ہوگا۔ احکام میں اعلیٰ درجہ فرضیت و حرمت کا ہے اور نصوص میں اعلیٰ درجہ قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ کا ہے لہٰذا اعلیٰ نص سے اعلیٰ حکم ثابت ہوگا۔

دوسری اور تیسری قسم سے اگر امر کا صیغہ ہو تو کبھی سنّت اور کبھی واجب کا ثبوت ہوگا اور نہی کا صیغہ ہو تو مکروہ تحریمی کا ثبوت ہوگا بس فرق دونوں میں اتنا ہوگا کہ اگر مواظت ہے تو واجب ورنہ سنّت، سنّت سے مراد سنّت مؤکدہ۔

چوتھی قسم اگر امر کا صیغہ ہو تو استحباب ثابت ہوگا اور نہی کا صیغہ ہو تو مکروہ تنزیہی یہ امام صاحبؒ نے اعطاء کل ذی حق حقہ کے قاعدہ کی رو سے احکام کے ثبوت کے لیے چار قسمیں کی ہیں۔ جیسی نص ویسا اس کا حکم۔ (تحفۃ العبقری)

(۱) احکام: یہ حکم کی جمع ہے حکم وہ ہے جس سے انسان کے اعمال کا وہ وصف متعیّن ہو جس کو شریعت نے بیان کیا ہے مثلاً کسی عمل کو واجب و فرض یا حرام و مکروہ قرار دینا۔

(۲) فرض: وہ ہے جس کا کرنا ضروری ہو اور وہ دلیل قطعی سے ثابت ہو جیسے نماز میں قرأت، فرض پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے، عمل پر ثواب اور ترک پر گنا ہوتا ہے اور مناسب تاویل کے بغیر اس کا انکار کفر ہے۔

(۳) واجب: وہ ہے جس کا کرنا ضروری ہو اور وہ دلیل ظنی سے ثابت ہو جیسے نماز میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کا حکم۔

واجب پر عمل ضروری ہے، عمل پر ثواب اور ترک پر گناہ ہے لیکن انکار کفر نہیں ہے۔ وہ تمام اعمال جن کا ضروری ہونا خبر واحد یا قیاس سے ثابت ہو یا قرآن کی ایسی آیت سے ثابت ہو جن میں ایک سے زیادہ معنی کی گنجائش ہے، واجب کہلاتے ہیں۔

فرائض و واجبات کی دو قسمیں ہیں: عینی، کفائی:

(۴) عینی: وہ فرائض و واجبات ہیں جو اشخاص و افراد پر انفرادی حیثیت سے واجب ہوتے ہیں جیسے: نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ

(۵) کفائی: وہ فرائض و واجبات ہیں جو اجتماعی حیثیت سے واجب ہوتے ہیں اگر کچھ لوگ ان کی تعمیل کرلیں تو دوسروں سے بھی ترک عمل کا بار گناہ اتر جاتا ہے جیسے نماز جنازہ جیسے دین کے تفصیلی علم کا حاصل کرنا، جہاد اور قضاء وغیرہ

(۶) فرض و واجبِ مطلق: وہ ہیں جن کے لیے شریعت نے کوئی وقت مقرر نہیں کیا ہے۔ جیسے کفارات ان کو کبھی بھی ادا کیا جائے یہ ادا ہی کہلاتے ہیں۔

(۷) فرض و واجبِ مقید: وہ ہیں جن کے لیے شریعت نے وقت مقرر کیا ہو ان کو فریضۂ موقتہ بھی کہتے ہیں، جیسے نماز، روزۂ رمضان مبارک، ان کو وقت پر ادا نہیں کیا جائے تو

یہ قضا کہلاتے ہیں۔ حج کے لیے وقت مقرر ہے لیکن چوں کہ یہ عمر میں ایک ہی بار فرض ہے اس لیے کبھی بھی ادا کیا جائے ادا ہی کہلائے گا۔

(۸) مندوب: وہ ہے جس کا کیا جانا مطلوب ہو لیکن نہ ضروری ہو اور نہ اس کے ترک پر مذمت کی گئی ہو۔

مندوب کی تین قسمیں ہیں: سنّتِ مؤکدہ، سنّتِ غیر مؤکدہ، مستحب:

(۹) سنّتِ مؤکدہ: وہ ہے جس سے کسی واجب کی تکمیل ہوتی ہو جیسے اذان وجماعت یا آپ ﷺ نے اس پر مواظبت فرمائی ہو اور کبھی کبھی چھوڑا ہو جیسے وضو میں ناک میں پانی ڈالنا یا فرض نمازوں سے پہلے کی سنّت مؤکدہ، اس کو سنّتِ ہدی بھی کہتے ہیں۔ سنّت مؤکدہ کے تارک کی فہمائش کی جائے گی، سرزنش نہیں کی جائے گی البتہ اس کا بار بار یا مسلسل ترک کرنا مکروہ اور باعث گناہ ہے۔

(۱۰) سنّتِ غیر مؤکدہ: وہ ہے جس پر آپ ﷺ نے مواظبت نہیں فرمائی ہے، جیسے بعض نمازوں میں طویل قرأت، اچھے کام کو دائیں طرف سے شروع کرنا وغیرہ۔ ان کے کرنے پر ثواب ہے مگر نہ کرنے پر گناہ نہیں ہے۔ ان کو نفل اور مستحب بھی کہہ دیا جاتا ہے اور بعض دفعہ فقہا اسی صورت کو مندوب سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۱۱) سنّت زائدہ: جن امور کو آپ ﷺ نے عادۃً کیا ہے وہ سنّتیں زائدہ ہیں، جیسے آپ کے کھانے پینے کا طریقہ، خواب واستراحت اور نشست وبرخواست کے انداز، ان کو آداب کہتے ہیں۔ عام طور پر ان کو مستحب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر ان افعال میں آپ ﷺ کی اتباع کی نیت ہو تو ثواب ہے اور ان شاء اللہ اس پر عبادت کا اجر حاصل ہوگا، اگر نہ کیا جائے تو نہ باعث گناہ ہے اور نہ باعثِ گرفت، البتہ تربیت

کے طور پر گرفت کی جاسکتی ہے۔

(۱۲) حرام: وہ ہے جس سے اجتناب کرنا ضروری ہو اور اس کا ممنوع ہونا یقینی دلیل سے ثابت ہو، جیسے زنا، چوری، سود۔ اس کو ترک کرنا ضروری ہے اور قدرت ہونے کے باوجود اس سے بچنے پر ثواب ہے اضطراری کیفیت کے بغیر اس کا ارتکاب باعث گناہ ہے اور مناسب تاویل کے بغیر انکار کفر ہے۔

حرام کی دوقسمیں ہیں: حرام لعینہ، حرام لغیرہ:

(۱۳) حرام لعینہ: وہ ہے کہ خود اس کے اندر وہ وصف موجود ہو جس کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا گیا ہے جیسے: سود لینے کی حرمت، شراب کی حرمت۔

(۱۴) حرام لغیرہ: وہ ہے جس کی ممانعت کسی خارجی سبب کی بنا پر ہو جیسے: سود دینے کی حرمت کیوں کہ مقروض کا اپنی طرف سے اضافہ کے ساتھ قرض کا واپس کرنا گناہ نہیں ہے، ممانعت اس سبب سے ہے کہ اس سے سود خوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اگر سود دینے والے نہ ہوں تو سود خوروں کا کاروبار نہ چلے۔

(۱۵) مکروہِ تحریمی: وہ ہے جس کی ممانعت یقینی دلیل سے ثابت نہ ہو بلکہ ظنی دلیل سے ثابت ہو جیسے استنجاء کے وقت قبلہ کی طرف چہرہ یا پشت رکھنا اور اسبال۔ مکروہِ تحریمی سے بچنا واجب ہے، بلا عذر اس کا مرتکب باعث گناہ ہے اور اس کے ممنوع ہونے کا انکار کرنا گمراہی تو ہے لیکن کفر نہیں۔

وہ تمام اعمال جن کی ممانعت خبر واحد یا قیاس سے ثابت ہو یا قرآن کی ایسی آیت سے ثابت ہو جس میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے مکروہ تحریمی ہیں اگر فقہ کی کتاب میں

مطلقاً مکروہ لکھا جائے تو اکثر اس سے مکروہ تحریمی ہی مراد ہوتا ہے۔

(۱۶) مکروہِ تنزیہی: وہ ہے جس سے بچنے کا مطالبہ کیا گیا ہو لیکن اس کے ترک کو لازم نہ قرار دیا گیا ہو جیسے کھڑے ہو کر پانی پینا یا پیشاب کرنا۔

اس سے بچنا مدح و ثواب کا باعث ہے اور اس کا مرتکب ہونا ملامّت اور عتاب کا نہ کہ گناہ کا۔

بعض اوقات مکروہِ تنزیہی کو خلافِ اوّلی بھی کہا جاتا ہے جب کہ بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ خلافِ اوّلیٰ کا درجہ مکروہِ تنزیہی سے بھی کم ہے، کیوں کہ مکروہ تنزیہی کا مرتکب ملامت اور عتاب کا مستحق ہے اور خلافِ اولیٰ کے ارتکاب پر ملامّت اور عتاب کی بھی گنجائش نہیں۔

(۱۷) مباح: مباح سے مراد وہ افعال ہیں جن کے کرنے اور نہ کرنے کا بندہ کو اختیار دیا گیا ہے، جیسے: کھانا، پینا وغیرہ۔

اس کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہے، نہ کسی پہلو میں ثواب ہے اور نہ ملامت یا گناہ، البتہ نیت کے اعتبار سے ثواب وعذاب مرتب ہوتا ہے جیسے کھانا اس لیے کھائیں کہ طاقت ہوگی تو عبادت کریں گے، تو اس پر ثواب ہوگا اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت ظلم کے لیے استعمال کرنے کی نیت ہو تو گناہ ہوگا۔

جس کا مباح ہونا یقینی دلیل (قرآن، حدیثِ متواتر، اجماع) سے ثابت ہو اس کا انکار کرنا باعث کفر ہے۔ جیسے کھانے کے لیے مباح ہونا کا انکار کرنا، مرد کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کا انکار۔

مباح کو جائز بھی کہا جاتا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ جائز مکروہ کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے اور مباح مکروہ کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا یعنی جو فعل مباح ہوگا وہ بلاکراہت جائز ہوگا اور جائز کبھی مکروہ ہوگا اور کبھی مکروہ نہ بھی ہوگا۔ جیسے کھانا کھانا مباح ہے اور کھڑے ہوکر پانی پینا جائز ہے۔

(۱۸) سبب: جس چیز کو شارع نے کسی دوسری شئ کے وجود کے لیے علامت کا درجہ دیا ہو اور ان دونوں کا وجود و عدم ایک دوسرے سے مربوط ہو اس کو سبب کہتے ہیں۔ جیسے وقت کو نماز کے لیے سبب قرار دیا گیا، جب پایا جائے گا، تب نماز فرض ہوگی، ماہ رمضان کی آمد کو روزہ کے واجب ہونے کے لیے سبب ٹھہرایا گیا، جب تک رمضان نہیں آئے گا روزہ فرض نہیں ہوگا، نماز کا وقت اور رمضان کا مہینہ یہ سبب ہے نماز اور روزہ کا فرض ہونا مسبب ہے۔

(۱۹) شرط: شرط سے مراد ہے وہ عمل ہے جس کے پائے جانے پر دوسرے عمل کا درست ہونا اور پایا جانا موقوف ہو اور اگر شرط نہیں پائی جائے تو شرعا وہ دوسرا عمل بھی وجود میں نہ آئے، جس کو مشروط کہتے ہیں جیسے نماز کے درست ہونے کے لیے وضو شرط ہے تو چاہے سبب متحقق ہو بھی اور نماز کا وقت آجائے پھر بھی جب تک یہ شرط نہ پائی جائے نماز درست نہیں ہوگی۔

سبب اور شرط میں فرق یہ ہے کہ سبب کے وجود سے مسبب لازم ہوجاتا ہے۔ جیسے نماز کا وقت آجانے کے بعد نماز فرض ہوجاتی ہے لیکن شرط کے وجود سے مشروط لازم نہیں ہوتا مثلاً وضو کی وجہ سے نماز پڑھنا واجب نہیں ہوجاتا۔

(۲۰) رکن: وہ جو کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت میں داخل ہو کہ اگر وہ (رکن) نہ پایا جائے

تو وہ چیز ہی متحقق اور موجود نہ ہو جیسے رکوع نماز میں۔

(۲۱) علّت: علت وہ ہے جو کسی شئ میں مؤثر ہو بالفاظ دیگر علت کے تحقق و وجود کے بعد معلول کا تحقق و وجود ضروری ہے، جیسے: حلال ہونے کے لیے عقد نکاح علت ہے جیسے ہی عقدِ نکاح یعنی ایجاب و قبول ہو گیا حلّت متحقق ہو جائیگی۔

(۲۲) مانع: مانع وہ ہے جو سبب کے پائے جانے کے باوجود حکم کو نافذ نہ ہونے دے جیسے بیٹا باپ کو قتل کر دے تو میراث سے محروم ہو گا حالاں کہ رشتہ داری یعنی بیٹا ہونا جو کہ سبب ہے موجود ہے مگر قتل مانع بن گیا۔

(۲۳) عزیمت: اصل حکم جو عام حالات کے لیے ہو اس کو "عزیمت" کہتے ہیں جیسے رمضان میں روزہ رکھنا، ظہر، عصر اور عشاء حالت حضر میں چار ادا کرنا۔

(۲۴) رخصت: وہ حکم جو کسی عذر یا عارضی بات پیش آنے کی وجہ سے دیا جائے جیسے مریض یا مسافر کے لیے رمضان میں روزہ نہ رکھنا اور سفر کی حالت میں ظہر و عصر اور عشاء میں صرف دو رکعتوں پر اکتفا کرنا۔

عزیمت پر عمل کرنا فرض ہے بشرطیکہ جان کا خوف نہ ہو۔ البتہ اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے کہ جان کے خوف سے کلمۂ کفر کہنا جائز ہے یہ حکم رخصت ہے اس کے مقابلہ میں جان دے دینا اور کلمۂ کفر نہ کہنا عزیمت ہے اور یہاں عزیمت پر عمل کرنا اولی ہے گو جان کے چلے جانے کا اندیشہ ہو۔

رخصت پر عمل کرنا جائز اور خلافِ اولیٰ ہے اس سے بھی ایک صورت مستثنیٰ ہے اور وہ ہے سفر کی نماز میں قصر کرنا اگر چہ یہ رخصت ہے لیکن چار رکعت پڑھنا درست نہیں۔ رخصت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

(۲۵) اولیٰ: دو جائز کاموں میں جو افضل ہوتا ہے اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح ''احری'' اور ''احق'' کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے، خلافِ اولیٰ اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی فضل نہ ہو بلکہ اس میں ہلکی سی کراہت ہو اور جو خلافِ اولیٰ کا ارتکاب کرے تو اس کے لیے ''اساء'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس کا حکم کراہت سے کم درجہ کا ہے یا وہ تحریم اور مکروہِ تنزیہی کے درمیان کا درجہ ہے یا کراہت سے بھی بُرا ہے۔

مندوب و مستحب کے لیے اولیٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے عموماً جب '' لا بأس'' کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب خلافِ اولی ہوا کرتا ہے۔

(۲۶) ادب: بہتر اور پسندیدہ افعال و اقوال جن کے استعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک اس کا اطلاق مستحب پر بھی ہوتا ہے۔

(۲۷) حدیث: رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نبیِ کریم ﷺ کے سامنے کوئی کام کسی نے کیا ہو اور آپ نے نہ روکا نہ اس پر نکیر فرمائی بلکہ برقرار رکھا۔

(۲۸) اجماع: رسول اللہ ﷺ کے بعد اُمّت محمدیہ کے مجتہدین کا کسی بھی زمانہ میں کسی حکم شرعی کی بابت اتفاق کر لینا اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اُمّت کا اجماع معتبر نہیں، نہ کسی بھی عہد میں عام مسلمانوں کا اتفاق اجماع ہے، نہ اکثر مجتہدین کی رائے اجماع کہلاتی ہے۔

اجماع کی دو قسمیں ہیں:

(۲۹) اجماعِ قولی: یہ ہے کہ تمام مجتہدین صراحتاً کسی رائے پر اتفاق کا اظہار کر دیں جیسے

صحابۂ کرامؓ کا اس امر پر اجماع کہ دادی چھٹے حصہ کی وارث ہوگی۔

(۳۰) اجماعِ سکوتی: کسی مسئلہ میں بعض مجتہدین اپنی رائے کا اظہار کریں اور دوسرے لوگ اس پر سکوت اختیار کریں۔ جیسے اعضائے انسانی کو عطیہ کرنے کا ناجائز ہونا۔

(۳۱) خبرِ متواتر: حدیث کو خبر بھی کہتے ہیں، وہ حدیث جس کو صحابہ کے دور سے آج تک ایک اتنی بڑی جماعت نقل کرتی آئی ہو جن کا عادۃً جھوٹ پر اتفاق کرلینا محال ہو، اس کو خبر متواتر یا حدیث متواتر کہتے ہیں۔

(۳۲) خبرِ مشہور: وہ حدیث ہے جس کو صحابہ کے دور میں ایک دو اشخاص نے نقل کیا ہو، لیکن عہد تابعین میں اتنی بڑی جماعت ناقل ہو کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر اتفاق کرلینا ناقابل تصور ہو۔

(۳۳) خبرِ واحد: وہ حدیث ہے جس کو ہر دور میں اتنے لوگوں نے روایت نہ کیا ہو جن کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو، بلکہ ایک دو یا کچھ زیادہ افراد روایت کریں۔ زیادہ تر حدیثیں اس قسم کی ہیں۔

(۳۴) قیاس: علت کے مشترک ہونے کی بنا پر غیر منصوص واقعہ یعنی ''فرع'' میں منصوص صورت یعنی ''اصل'' کا حکم لگانے کو قیاس کہتے ہیں۔

اصل (منصوص حکم) سے مراد وہ صورت ہے جو صراحتاً کتاب وسنّت میں مذکور ہو یا اجماع سے ثابت ہو اس کو مقیس علیہ بھی کہتے ہیں جیسے شراب کا حرام ہونا۔

فرع (غیر منصوص) سے مراد وہ واقعہ جس کا نص میں صراحتاً ذکر نہیں لیکن منصوص صورت کا حکم اس میں لگایا جائے اس کو مقیس بھی کہا جاتا ہے مثلاً بھنگ۔

علت سے مراد وہ خاص سبب جس کی وجہ سے اصل میں کوئی خاص حکم لگایا جاتا ہے جیسے نشہ آور ہونا شراب کے حرام ہونے کی علت ہے تو یہ حکم فرع یعنی بھنگ میں بھی ہے تو شراب کا حکم بھنگ میں لگایا جائے گا اور بھنگ بھی قیاس کی وجہ سے حرام ہوگی۔

(۳۵) اجتہاد: فقیہ کا حکم شرعی کو جاننے کے لیے نصوص قوت وصلاحیت کے مطابق کوشش کرنا۔

(۳۶) استدلال: کسی حکم پر معتبر شرعی دلیلوں کے ذریعہ حجت قائم کرنا۔

(۳۷) استحسان: کسی قوی تر دلیل کی بنا پر قیاس کے چھوڑ دینے کو استحسان کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کتاب اللہ، حدیث، اجماع، قوی تر قیاس، آثار صحابہ اور ضرورت ومصلحت کی بنیاد پر قیاسِ ظاہر کو چھوڑ دینا۔ جیسے قیاس کا تقاضہ ہے کہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جائے کیوں کہ کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر حدیث میں ہے کہ ”جب کوئی بھول سے کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے اس لیے کہ اللہ نے اس کو کھلایا پلایا۔“ اس بنا پر قیاس کو چھوڑ کر اس سے قوی تر دلیل (یہاں حدیث ہے) پر عمل کرنا استحسان کہلاتا ہے، قوی تر دلیل کبھی قرآن کی آیت ہوتی ہے کبھی حدیث کبھی اجماع کبھی ضرورت ومصلحت کبھی عرف تو کبھی قیاس خفی۔

(۳۸) عرف: کسی فعل یا قول کی بابت عامۃ الناس کے طریقہ کو عرف کہتے ہیں۔ بیان وتعبیر میں عام لوگوں کے استعمال کو ”عرف قولی“ کہتے ہیں، جیسے لفظ حرام سے طلاق کا مراد لیا جانا اور عملی اعتبار سے عام لوگوں کے طریقہ کو ”عرف فعلی“ کہتے ہیں۔ جیسے فریج، موبائل وغیرہ کی خرید وفروخت میں ایک مدّت کی گارنٹی۔

(۳۹) عرفِ عام: مختلف علاقوں کے عام لوگوں کے عرف اور طریقہ کو عرف عام کہتے ہیں جیسے استصناع یعنی آڈر دے کر کسی چیز کو بنوانا۔

(۴۰) عرفِ خاص: کسی خاص علاقہ یا خاص پیشہ وطبقہ کے طریقہ کو "عرف خاص" کہتے ہیں جیسے اہلِ عراق کا عرف ہے کہ گھوڑے کو "دابہ" کہتے ہیں۔

(۴۱) عرفِ صحیح: لوگوں کا وہ طریقہ ہے جو نص یا اجماع کے خلاف نہ ہو۔

(۴۲) عرفِ فاسد: لوگوں کا وہ طریقہ ہے جس سے کوئی حلال، حرام یا حرام، حلال قرار پاتا ہو جیسے، مردوں اور عورتوں کا عام مجلسوں میں اخلاط اور بینک میں فکس ڈپازٹ رکھنا وغیرہ۔

(۴۳) استصحاب: تغیر کا کوئی سبب پیش نہ آنے کی وجہ سے، سابقہ حکم کے برقرار رکھنے کو استصحاب کہتے ہیں، جیسے کوئی شخص باوضو ہے اور اس کو وضو کے باقی رہنے میں شک ہو گیا تو وضو کے باقی رہنے کا حکم لگایا جائے گا۔

(۴۴) ضرورت: ضرورت کو تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا یہی صورت اضطرار کی ہے، ایسی صورت میں حرام یا ممنوع چیز کا استعمال چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

(۴۵) حاجت: حاجت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیزوں کو استعمال نہ کریں تو ہلاک تو نہیں ہو گا مگر مشقت وتکلیفِ شدید ہو گی یہ صورت اضطرار کی نہیں، اس کے واسطے روزے، نماز، طہارت کے بہت سے احکام میں رعایت وسہولت تو دی گئی ہے مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں حلال نہیں ہو گی۔

(۴۶) منفعت: منفعت یہ ہے کہ چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے

گا لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں، جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں، منفعت کے لیے کوئی حرام حلال نہیں ہوتا، مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہوسکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل ہوسکے تو صبر کرے۔

(۴۷) زینت: جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں محض حصولِ خواہش ہے ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴۸) فضول: وہ ہے جو زینت، مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہو اس کا حکم بھی ظاہر ہے اس کے لیے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضول کی مخالفت احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے۔

(۴۹) تحرّی: کسی دلیل کے موجود ہونے کی وجہ سے رجحان قلب کی بنیاد پر مشتبہ امور میں دو پہلوؤں میں سے بہتر اور موزوں صورت کو متعیّن کرنا جیسے سفر میں قبلہ کا رخ متعیّن کرنا۔

(۵۰) تطوع: فرائض اور واجبات کے علاوہ جو امور شریعت میں محبوب و محمود ہوں جسے نفل نماز، نفلی روزہ۔

(۵۱) تقلید: دلیل طلب کیے بغیر ایسے شخص کی رائے کی اتباع کرنا جس کا قول بذات خود دین میں حجت نہ ہو، اس حسن ظن کے ساتھ کہ اس کی رائے درست ہوگی جیسے چاروں مسالک کے متبعین اپنے اپنے امام کی اتباع کرتے ہیں۔

(۵۲) تحقیقی جواب: وہ دلیل جو حقائق پر مبنی ہو اور فریقین کے نزدیک مسلم ہو۔

(۵۳) الزامی جواب: وہ جواب اور دلیل جو محض فریق مخالف کے نزدیک مسلم ہو اور سامنے والے کو صرف خاموش کرنا مقصود ہو۔

(۵۴)حظر: جس کا ارتکاب باعث گناہ اور جس سے بچنا باعث ثواب ہو، جیسے بد نظری۔

(۵۵)ظن: ظن غالب اور شک: کسی چیز کے ہونے نہ ہونے میں تردد کو شک کہا جاتا ہے بشرطیکہ کسی ایک جانب کو ترجیح اور غلبہ نہ ہو رہا ہو اور اگر تردد کے وقت ایک جانب ترجیح اور غلبہ حاصل ہو جائے تو اس کو ظن کہا جاتا ہے۔ اور اگر وہ ظن بہت زیادہ ہو لیکن یقین کے درجہ تک نہ پہنچتا ہو تو اس کو غلبۂ ظن اور ظنِ غالب کہتے ہیں۔ اور جو جانب مغلوب ہو اس کو وہم کہا جاتا ہے۔

(۵۶)قاعدہ: وہ حکم کلی جو ایک سے زائد ابواب میں جاری ہوتا ہے جسے یقین یقین ہی سے زائل ہوتا ہے نہ کہ شک سے الیقین لا یزول بالشك۔

(۵۷)ضابطہ: وہ حکم کلی جو صرف ایک باب میں جاری ہوتا ہے جیسے نماز میں خلافِ ترتیب قرآن پڑھنے سے تکراراً ہون ہو۔

شریعت: ملت اور دین مترادف کلمات ہیں سب کا مفہوم ایک ہے۔

(۵۸)شریعت: اللہ تعالیٰ نے جو دین و دستور اور راہ عمل اپنے بندوں کے لیے مشروع و جاری کیا۔ ماشرعه الله تعالیٰ لعباده مِن الدین.

(۵۹)دین: ما وضعه الله تعالیٰ وأنزله لنفع العباد بواسطة الأنبیاء علیهم السلام. یعنی وہ قانونِ الٰہی جو اللہ تعالیٰ نے بنایا اور اپنے بندوں کو نفع دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے نازل کیا۔ دین کے معنیٰ اطاعت ہیں اور اسی لیے اس کو دین کہتے ہیں کہ اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔

(۶۰) ملّت: وہ شریعت اور قوانین ہیں جو وحی اور احادیث کو کتابت کے ذریعہ محفوظ فرمایا گیا ہو، ملّت املا سے ہے، اس کا املا اور اس کی کتابت کی جاتی ہے اس کو ملّت کہا جاتا ہے۔

(۶۱) مجتہدِ مطلق مستقل: وہ شخص جو بغیر کسی کے تقلید کئے اور بغیر کسی کے مذہب کے پابند ہوئے مستقل طور پر شرعی دلائل سے شرعی احکام حاصل کرتا ہے جیسے ائمۂ اربعہ۔

(۶۲) مجتہدِ مطلق منتسب: وہ فقیہ ہیں جو مجتہد مطلق مستقل کے طرزِ اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا اجتہاد مجتہد مطلق مستقل کے اجتہاد کے موافق رہتا ہے، جیسے امام مزنی اور امام ابو ثور رحمہم اللہ۔

(۶۳) مجتہدِ مقیّد: وہ شخص ہے جو اپنے امام کے مذہب کو مستقل طور پر دلائل سے ثابت کرتا ہے لیکن اپنے دلائل میں اپنے امام کے اصول وقواعد سے تجاوز نہیں کرتا۔

(۶۴) فقیہ النفس: وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ مین کثرت مہارت کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بعیر صحیح نتیجے پر پہنچ سکتا ہو اور اپنے امام کے مذہب کا حافظ اور اپنے مذہب کے دلائل کا جاننے والا ہو۔

(۶۵) کتاب: کتاب اس عنوان کا نام ہے جو ایسے مسائل کا مجموعہ ہو جس کی جنس ایک اور نوع مختلف ہو جیسے طہارت ایک جنس ہے جس کے تحت وضو، غسل، طہارت مکان اور طہارت بدن وغیرہ یہ مختلف قسم کی انواع ہیں گویا کتاب بمنزلہ جنس ہے جس کے تحت مختلف نوع کے مسائل آتے ہیں۔

(۶۶) باب: ان مسائل کا مجموعہ جس کی نوع متحد ہو اور صنف مختلف ہو۔

(۶۷) فصل: ان مسائل کا مجموعہ جس کی صنف متحد ہو شخص اور جزئی مختلف ہو۔

(۶۸)صنف: نوع کے اندر کچھ خصوصیت کے اضافہ سے صنف ہو جاتا ہے جیسے انسانوں میں مرد کے انسان نوع ہے اور مرد و عورت صنف ہیں۔

(۶۹)شخصی و جزئی: صنف میں کچھ خصوصیت بڑھادینے سے اشخاص بن جاتے ہیں عورتوں میں زینب، عائشہ وغیرہ اور مردوں میں زید و بکر وغیرہ یہ سب افراد صنف ہے۔

(۷۰)عمومِ بلوٰی: عمومِ بلوٰی دو لفظوں سے مرکب ہے:(۱) عموم اور (۲) بلوٰی۔ عموم کا لغوی معنی ہے: عام ہونا، پھیل جانا۔ اور لفظِ بلوٰی کا لغوی معنی: آزمائش، اُمتحان اور مشقت کے ہیں۔

اصطلاح میں عمومِ بلوٰی سے مراد یہ ہے کہ کوئی ممنوع چیز اتنی عام اور اس قدر پھیل جائے کہ عام آدمی کے لیے اس سے بچنا واقعتاً مشکل اور دشوار کن ہو جائے۔ اسی کو ابتلائے عام بھی کہا جاتا ہے۔

(۷۱)امرِ تعبّدی: اس حکم شرعی کو کہتے ہیں جس کی اصل حکمت و علت عقل سے پوری طرح درک نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس پر عمل محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور بندگی کے تقاضے کے طور پر کیا جاتا ہے۔

(حوالہ: تمام اصطلاحات مختلف کتابوں سے لی گئی ہیں بالخصوص آسان اصولِ فقہ، آسان فقہی اصطلاحات،، فتویٰ تعارف اصول وآداب وغیرہ)

متونِ معتبرہ و غیر معتبرہ:

متونِ معتبرہ:

متاخرین کی اصلاح میں جب لفظ متون بولا جاتا ہے تو اسے صرف متون کی معتبر

کتابیں مراد ہوتیں ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱. البدایۃ: از امام ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ (متوفی ۵۳۹ھ)

۲. مختصر القدوری: از ابوالحسن احمد بن محمد قدوریؒ (متوفی ۴۲۸ھ)

۳. المختار: از ابوالفضل مجد الدین عبداللہ بن محمود موصلیؒ (متوفی ۶۸۳ھ)

۴. الوقایۃ: از تاج الشریعۃ محمود بن صدر الشریعۃ (متوفی ۶۷۳ھ)

۵. النقایۃ: از تاج الشریعۃ عبید اللہ بن سعود حنفیؒ (متوفی ۷۴۵ھ)

۶. کنز الدقائق: از ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفیؒ (متوفی ۷۱۰ھ)

۷. ملتقی الابحر: از ابراہیم بن محمد حلبیؒ (متوفی ۹۵۶ھ)

۸. مجمع البحرین: از مظفر الدین احمد بن علی بن ثعلب ساعاتی بعلبکیؒ ۶۹۴ھ)

۹. تحفۃ الفقہاء: از علاء الدین محمد بن احمد سمرقندیؒ

جب فقہ میں متونِ ثلاثہ بولا جاتا ہے تو اس سے تین متن: وقایہ، کنز اور مختصر القدوری مراد ہوتے ہیں۔ اور جب متونِ اربعہ بولتے ہیں تو ان کے ساتھ مجمع البحرین یا مختار کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ سب متون زیادہ تر مذہب کی روایاتِ ظاہرہ اور مشہور اقوال پر مشتمل ہیں اس لیے معتبر ہیں۔

متون و شروح غیر معتبرہ: (۱) شرح النقایۃ للقہستانیؒ جو جامع الرموز کے نام سے مشہور ہے۔ (۲) الدر المختار (۳) الاشباہ والنظائر (۴) شرح الکنز للملا مسکینؒ (۵) القنیۃ للزاھدیؒ (۶) النھر الفائق (۷) شرح الکنز للعینیؒ (۸) السراج الوہاج (۹) الجوھرۃ النیرۃ (۱۰) کنز العباد فی شرح الاوراد (۱۱) خزانۃ الروایات (۱۲) خلاصۃ الکیدانی (۱۳) الحاوی للزاھدی (۱۴) الفتاوی

الصوفیہ وغیرہ۔

(فتاویٰ نویسی کے رہنما اصول، ص:۲۶۱۔ فتویٰ تعارف اصول وآداب، ص:۲۰۱۔)

اوازن:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: شریعت کے بہت سے احکام ناپ تول سے متعلق ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے عرب کے اوزان اور پیانوں کے مطابق ارشاد فرمایا ہے، مثلاً: صاع، مُد، اوقیہ، درھم، دینار، مثقال وغیرہ۔

بلادِ ہندو پاکستان میں دوسری طرح کے اوزان اور پیانے رائج ہیں، اس لیے ان احکام کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ شرعی اوزان اور پیمانوں کی مقداریں ہندو پاکستان کے مروجہ اوزان اور پیمانوں سے بتلائی جائیں۔

مقدار کی تعریف: جس سے معلوم کیا جائے کہ تولی اور ناپی جانے والی چیز کتنی ہے وہ مقدار کہلاتی ہے۔ لمبائی اور چوڑائی جاننے کے لیے ناپا جاتا ہے اور وزن معلوم کرنے کے لیے تولا جاتا ہے۔ افراد اور عدد دریافت کرنے کے لیے گنا جاتا ہے۔

وزن کے لیے پہلے اوقیہ اور قیراط وغیرہ رائج تھے اور اب کلوگرام کے ذریعہ تولا جاتا ہے، ناپنے کے لیے عہدِ نبوی ﷺ میں صاع ورطل، مدوغیرہ سے کام لیا جاتا تھا اب ان کی جگہ لیٹر نے لے لی ہے۔ اور مساحت کے لیے ذراع وباع مستعمل تھے اب گز اور میٹر آگیا اور مسافت ک لیے بُرد اور فرسخ سے اندازہ لگایا جاتا اور اب کلومیٹر ہے۔ اس لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔

(۱) صاع: صاع ایک ناپنے کا پیمانہ ہے جس سے شئ کی مقدار کو معلوم ومتعیّن

کیاجاتاہے۔ یعنی ایک برتن ہو اکرتا تھا جس میں غلہ، اناج کی خرید وفروخت کرتے تھے۔صاع تین قسم کے ہیں:

(۱)صاعِ ہاشمی = ۳۲/ رطل۔

(۲)صاعِ حجازی = ۵/ رطل اور ثُلث رطل۔

(۳)صاعِ عراقی = ۸/ رطل، صاعِ عراقی کوصاعِ حجاجی بھی کہتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صاعِ عراقی کااعتبار کیاجاتا ہے اور امام ابویوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے یہاں صاعِ حجازی معتبر ہے۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صاعِ عراقی بھی رائج تھا۔(جوکہ صاعِ حجازی سے بڑا تھا) اور صاعِ حجازی بھی۔ صدقۃ الفطر میں احوط یہ ہے کہ صاعِ عراقی کالحاظ کیاجائے کیوں کہ بڑا ہے۔

علامہ ابن لہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں ان حضرات میں اختلاف لفظی ہے اس لیے کہ اصل اختلاف رطل میں ہے اہل مدینہ (حجاز) کے ایک رطل میں ۳۰/ استار کے گیہوں سماتے ہیں، یعنی وہ بڑا ہے اور بغدادی (عراقی) رطل چھوٹا ہے اس میں صرف ۲۰/ استار گیہوں آتے ہیں تودونوں صاع برابر ہوگئے:

عراقی صاع = ۸ رطل، ایک رطل = ۲۰/ استار، لہٰذا ۸/ رطل = ۱۶۰/ استار

حجازی صاع = ۵/ رطل اور ثلث رطل۔ایک رطل = ۳۰/ استار لہٰذا ۵/ رطل اور ثلث رطل = ۱۶۰/ استار

ایک صاع کااندازہ اور بھی طریقوں سے لگایا گیاہے۔

ب:ایک صاع = ۱۰۴۰/ درہم

یعنی صاع جس کا اعتبار کیا جاتا ہے اس میں ۱۰۴۰ر درھم سماتے ہیں۔ (درہم کی تحقیق علماء آگے آرہی ہے ان شاء اللہ)

ج: ایک صاع = ۴ مد

اور ایک مد = دو رطل کا ہوتا ہے۔ (رطل اور مد کی تحقیق آگے آرہی ہے ان شاء اللہ)

د: ایک صاع = ۲۷۳ تولے

ھ: ایک صاع = ۳ر کلو ۱۴۹ر گرام ۲۸۰ر ملی گرام اور بعض حضرات کے نزدیک ۳۱۸۴ر گرام۔

ہ: ایک صاع = ۴ر لیٹر ۱۲۷ ملی لیٹر، ۳۰ر میکرو میلی لیٹر اور بعض کے نزدیک ۵ر لیٹر ۸۸ر ملی لیٹر۔

ذ: ایک صاع = ۳ر سیر ۳۳ر تولہ۔

استار = ٦ر درھم اور مثقال سے ۴ر مثقال کے برابر

ایک تولہ = ۱۱ء۶٦۴ر گرام۔

گرام = ۱۰۰۰ر ملی گرام

کلوگرام = ۱۰۰۰ر گرام = ۸۵ء۷۳۳ر تولے

سیر انگریزی = ۸۰ر تولہ = ۹۳۳ء۱۲ گرام۔

۲) رطل: اس کا بھی چند طریقوں سے اندازہ لگایا گیا ہے۔

- ایک رطل = ۱۳۰ر درھم کا ہوتا ہے۔
- ایک رطل = ۳۹۳ء٦٦ گرام

- ایک رطل = ۵۱۵ء۹۱۲/ ملی لیٹر
- ایک رطل = ۳۴ء۱۲۵/ تولہ
- ایک رطل = ۴۰۹ء۵ ماشہ

۳) مُد:

- ایک مد = ۲/ رطل، ایک مد ہی بعض حضرات کے نزدیک منِ شرعی ہے۔
- ایک مد = ۲۶۰/ درھم
- ایک مد = ۸۱۹/ ماشہ
- ایک مد = ۳۲۰ء۸۷۷/ گرام اور بعض کے نزدیک ۰۶۸ء۷۹۶/ گرام
- ایک مد = ۸۲۵ء۰۳۱ء۱/ (ایک لیٹر ۳۱/ ملی لیٹر ۸۲۵/ میکرو ملی لیٹر)
- ایک مد = ۲۵ء۶۸/ تولہ

بعض قدیم اوزان:

- چاوّل = ۲ دانہ رائی (خردل)
- ایک رتی = ۸/ چاوّل = ۵ء۱۲۱/ ملی گرام
- ایک ماشہ = ۸/ رتی = ۲ء۹۷/ ملی گرام
- ایک تولہ = ۹۶ رتی = ۶۶۴ء۱۱/ گرام
- ۱۲/ ماشہ = ایک تولہ
- ایک چھٹانک = ۵/ تولہ = ۳۲۰ء۵۸/ گرام
- ایک سیر = ۸۰/ تولہ = ۱۲۰ء۹۳۳/ گرام = ۱۶/ چھٹانگ

- ایک من = ۴۰/ سیر = ۸۰۰ء۳۲۴ء۳۷/ کلوگرام
- جَو۳ = / چاوّل
- ۵/ جو کے دانے = ایک قیرط = ۷ء۲۱۸/ ملی گرام
- ایک دانق = ۴/ قیراط = پونے چار رتی
- مکوک = ۵ء۱/ صاع = ۷۷۶۴۰۹ء۴/ کلوگرام = ۱۲/ رطل = ۱۵۶۰/ درھم
- آدھا صاع = ۱۵۹۲/ گرام
- قفیز = ۸/ مکوک = ۹۶/ رطل = ۲۱۱۲۷۲ء۳۸/ کلوگرام = ۱۲۴۸۰/ درھم
- کر = ۶۰/ قفیز = ۷۲۰/ صاع = ۵۷۶۰/ رطل = ۶۷۶۳۲ء۲۲۹۲/ کلوگرام
- فَرق = ۴۴۸ء۹/ کلوگرام
- قِربۃ = ۱۰۰/ رطل
- زق = ۵۰ من = ۱۰۰/ رطل = ۳۶۶ء۳۹/ کلوگرام

۴) **درھم:** درھم چاندی کا ہوا کرتا ہے۔

- ایک درھم = ۱۴/ قیراط
- ایک درھم = ۳/ ماشے ایک رتی اور خمس رتی = ۲۰ء۲۵/ رتی = ۱۵ء۳/ ماشہ
- ایک درھم = ۰۶۱۸ء۳/ گرام
- ایک درھم = ۲۶۲۵ء۰/ تولہ

زکات کا نصاب: ۲۰۰/ درھم جو چاندی کا نصاب ہے وہ تولے کے حساب سے ۵۰ء ۵۲/ تولہ چاندی اور گرام کے اعتبار سے ۳۶ء۶۱۲/ گرام چاندی۔

مہر کی کم سے کم مقدار: ۱۰/ درھم وہ تولہ کے اعتبار سے ۶۲۵ء ۲/ تولہ چاندی اور گرام کے اعتبار سے ۶۱۸ء۳۰/ گرام چاندی۔

مہرِ فاطمی: ۵۰۰/ درھم ہے یہ تولہ کے اعتبار سے ۲۵ء ۱۳۱/ تولہ چاندی اور گرام کے اعتبار سے ۵۳۹ء۱/ کلوگرام چاندی۔

۵)اوقیہ:

- ایک اوقیہ = ۴۰ درھم چاندی ۵/ اوقیہ چاندی ہوتو زکاۃ واجب ہوتی ہے۔
- ایک اوقیہ = ۵ء۱۰/ تولہ چاندی
- ایک اوقیہ = ۱۲۶/ ماشہ
- ایک اوقیہ = ۲۷۴ء۱۲۲/ گرام چاندی

۶)نَش:

- نش = نصف اوقیہ = ۲۰/ درھم = ۶۳/ ماشہ
- نش = ۲۵ء۵/ تولہ چاندی = ۲۳۶ء۶۱/ گرام چاندی

۷)دینار او مثقال: دینار اور مثقال کا ایک ہی وزن شمار کیا جاتا ہے۔ دینار سونے کا ہوتا ہے۔

- ایک دینار = مثقال = ۲۰/ قیراط
- ایک دینار / مثقال = ۵ء۴/ ماشہ
- ایک دینار / مثقال = ۳۶/ رتی
- ایک دینار / مثقال = ۳۷۳ء۰/ تولہ سونا

- ایک دینار / مثقال = ۴۷۳ء۴/ گرام سونا
- ۲۰/ دینار سونے میں زکاۃ واجب ہوتی ہے تو اس حساب سے ۵۰ء۷/ تولہ سونا اور گرام میں ۸۷ء۸۴/ گرام سونا۔

۸) **مَن:** من اور مد برابر ہیں مد کے سلسلے میں پہلے گذر چکا ہے۔

۹) **حِمل:** ایک حمل = ۳۰۰/ من = ۶۰۰/ رطل

- ایک حمل = ۲۳۸ء۸۲۱/ کلوگرام

۱۰) **وسق:** ایک وسق = ۶۰/ صاع = ۶۲۴۰۰/ درھم

- ایک وسق = ۲۴۰/ من
- ایک وسق = ۱۹۱ء۰۵۶۳۲/ کلوگرام
- ۵/ وسق کے اندر عشر واجب ہوتا ہے اس حساب سے ۵/ وسق ۹۵۵ء۲۸/ کلوگرام کا ہوگا۔

چند قدیم وجدید مساحتیں:

- ترکی نسل کے گھوڑے کی دم کے ۶/ بال چوڑائی میں = ایک جو کا دانہ چوڑائی میں
- ۶/ جو کے دانہ چوڑائی میں = ایک اصبع (انگلی)
- ۴/ اصبع = ایک قبضۃ (مٹھی)
- ۶/ اصبع = ایک شبر (بالشت)
- ایک قدم = ۴/ قبضات (۴ مٹھیاں)

- ایک ذراع = ۲۴/ اصبع = ۶قبضات
- ایک کلو میٹر = ۱۰۰/ میٹر
- ایک فٹ = ۱۲/ انچ
- ایک میٹر = ۱۰۰/ سینٹی میٹر
- ایک میٹر = ۳۷ء۳۹/ انچ
- ایک سینٹی میٹر = ۱۰/ ملی میٹر
- ایک انچ = ۵۴ء۲/ یعنی دو سینٹی میٹر چون ملی میٹر
- ایک گز = ۳۶/ انچ = ۴۴ء۹۱/ ملی میٹر = ۳/ فٹ
- ایک فرلانگ = ۲۲۰/ گز = ۱۷ء۲۰۲/ کلوگرام
- ایک کوس = ۲۳ء۲۳۴۶/ گز = ۷۹۲۰ء۲۱۴۵/ کلو میٹر
- جریب = ۱۵۱۲۰۰/ انچ = ۴۲۰۰/ گز۔
- سترہ کی لمبائی ایک ذراع ہونی چاہئے۔اس حساب سے
- ایک ذراع = ۵۰ء۱/ فٹ = ۱۸/ انچ = ۲ء۴۶/ سینٹی میٹر
- باع = ۴/ ذراع
- ایک غلوہ = ۴۰۰/ ذراع = ۸۰ء۱۸۴/ میٹر
- میل: میل جاننے کیلیے چند مساحت اور جانیے۔
- ایک مرحلہ = ۲/ برید = ۸/ فرسخ
- ایک برید = ۴/ فرسخ

- ایک فرسخ = ٣٦ر ہزار قدم اور ہر قدم نصف ذراع کا۔
- ایک فرسخ = ٣ر میل شرعی۔

راجح اور احوط قول کے مطابق ٤٨ر میل مسافت سفر ہے۔ لیکن میل دو ہیں ایک میل شرعی اور دوسرا میل انگریزی، ٤٨ر میل میں کونسا میل مراد ہے، علماء وفقہائے عصر کا اس سلسلے میں اختلاف ہے ایک جماعت کا کہنا ہے کہ میل سے مراد انگریزی میل ہے اور ایک جماعت میل شرعی کے قائل ہے۔ اور یہی صحیح واحتیاط والا مسلک ہے۔ اسی کو حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ، صاحب خیر الفتاویٰؒ، مولانا فضل الرحمن اعظمی، اور دیگر مفتیان کرام نے اختیار کیا ہے۔

میلِ شرعی، میل انگریزی اور کلو میٹر میں فرق:

ایک میل شرعی = ٢٠٠٠ر گز

ایک میل انگریزی = ١٧٦٠ر گز

ایک کلو میٹر = ١٠٩٣ء٦١ر گز

میل انگریزی، میل شرعی سے ١٣٦٣ء١ر گز چھوٹا ہے۔ اور کلو میٹر شرعی میل سے ٨٢٨ء١ر گز چھوٹا ہے۔ اور کلو میٹر، انگریزی میل سے ٦٠٩٣٤ء١ر گز چھوٹا ہے۔

ایک میل انگریزی = ٦٠٩٣٤٤ء١ر کلو میٹر

ایک میل شرعی = ٨٢٨٨ء١ر کلو میٹر

اب جنہوں نے انگریزی میل کا اعتبار کیا انہوں نے ٦٠٩٣٤٤ء١ر کلو میٹر میں ٤٨ر کو ضرب دیا تو حاصل ضرب ٢٤٨٥١٢ء٧٧ر کلو میٹر آیا انہوں نے اس کو مسافتِ قصر قرار دیا اور جنہوں نے شرعی میل کا اعتبار کیا انہوں نے ٨٢٨٨ء١ر کلو میٹر میں ٤٨ر کو ضرب دیا تو

حاصل ضرب ۸۲ ۷ء ۸۷/ کلو میٹر آیا۔ انہوں نے اسی کو مسافت قصر قرار دیا۔ یا بعض حضرات کے حساب سے ۸۶۴ء۸۸/ کلو میٹر۔

ماءِ کثیر کی مقدار: جس کا اندازہ دہ دردہ سے لگایا گیا ہے۔ یعنی ۱۰/ ذراع لمبا اور ۱۰/ ذراع چوڑا۔ لمبائی اور چوڑائی کو ضرب دینے سے مربع نکلتا ہے تو مجموعہ ۱۰۰/ ذراع ہونا چاہئے۔

ایک ذراع ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے اس حساب سے ۱۵/ فٹ لمبا اور ۱۵/ فٹ چوڑا ہونا چاہئے، مجموعہ ۲۲۵/ مربع فٹ دہ دردہ ہوتا ہے۔

میٹر کے اعتبار سے حوض کی لمبائی چوڑائی:

ایک ذراع ۴۶۲ء میٹر کا ہوتا ہے اس لیے دس ذراع ۶۲ء ۴/ میٹر لمبا ہوا اور وہی ۶۲ء ۴/ چوڑا اور مجموعہ ۴۴۴۳ء۲۱/ مربع میٹر ماءِ کثیر ہوا۔ اور بعض حضرات کے حساب سے ۹۰۳ء۲۰/ مربع میٹر۔

اور اگر کوئی حوض یا کنواں گول ہو تو اس کے بیچ کا قطر ۹۲۵ء۱۶/ فٹ ہونا چاہئے اور میٹر کے اعتبار سے ۱۵۸ء۵/ میٹر قطر ہونا چاہے۔ گول چیز کے درمیان کی لمبائی کو قطر کہتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: صحیح ترین مسافتِ سفر، الاوزان المحمودۃ، ثمرۃ الاوزان، تنشیط الاوزان وغیرہ)

تمت بحمد اللہ سبحانہ و تعالیٰ

ہدایہ، قدوری

اور

نور الایضاح

اور

ان کے مصنفین کا تعارف

پیش لفظ

فقہِ حنفی کی عظیم الشان اور معتبر کتابوں: ہدایہ، مختصر القدوری اور نور الایضاح اور ان کے جلیل القدر مصنفین کا تعارف پیش کرنے کے لیے یہ مختصر رسالہ تیار کیا گیا ہے۔

ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ تحریر نقلِ محض ہے، جس میں اصل مآخذ سے اخذ کردہ معلومات کو ایک جامع اور سلیس انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔

ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ سے متعلق مواد درج ذیل کتب و مقدمات سے ماخوذ ہے:

۱) ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا تعارف از مولانا محمد میاں صدیقی

۲) مقدمہ دکتور سائد بن محمد یحییٰ بکداش بر کتاب الھدایۃ

۳) امام مرغینانی کی کتاب ہدایہ کا تعارف از مولانا محمد طارق محمود

۴) مقدمہ اصولِ بدایہ از مولانا محمد نعمان

۵) آپ ہدایہ کیسے پڑھیں؟ از مفتی ابو الپابہ شاہ منصور

۶) مقدمة على الهداية (مطبوعة: المكتبة البُشرٰى)

مختصر القدوری اور امام قدوریؒ سے متعلق اکثر تحریر کا مواد مقدمہ دکتور سائد بن محمد یحییٰ بکداش کی "اللباب شرح الكتاب" سے لیا گیا ہے۔ جب کہ نور الایضاح سے متعلق حصہ کا ماخذ "مواهب الفتّاح مقدمة نور الإيضاح" از شیخ طلحہ منیار حفظہ اللہ ہے۔

اور اس سلسلے میں بھی ہمیں معاف رکھیے گا کہ کئی جگہوں پر ماخذ سے الفاظ لیے گئے ہیں لیکن حوالہ ذکر نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس معمولی کوشش کو قبول فرمائے اور

اس کے ذریعے اہلِ علم وطلبہ کے لیے ان عظیم فقہی مصادر سے استفادے کا ذوق اور فہم پیدا فرمائے۔ واللہ ولی التوفیق

العبد الضعیف

محمد یحیٰ ابن عبد الحفیظ انوری قاسمی

ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا تعارف

ہدایہ درسِ نظامی کی متداوِل اور معروف کتاب ہے، برِّصغیر پاک وہند کے اکثر دینی مدارس میں بہ طورِ نصاب شامل ہے۔ یہ کتاب اپنی استناد اور افادیت کی وجہ سے بے نظیر ہے۔ علمی قابلیت پیدا کرنے میں خاص اسے خاص دخل ہے۔ حتیٰ کہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”میرے خیال میں مولوی وہ ہے جس میں اس قدر استعداد ہو کہ ہدایہ کی چاروں جلدوں میں جو جگہ اس کو بتلائی جائے اس کو حل کر کے سمجھا اور پڑھا سکے۔“ (البلاغ بحوالہ: امام مرغینانی کی کتاب ہدایہ کا تعارف) اِس کتاب کی جلالتِ شان کی وجہ سے اسکے مصنّف علمی حلقے میں اپنے نام ”برہان الدین“ سے زیادہ ”صاحبِ ہدایہ“ کے نام سے معروف ہیں۔

مکمل نام اور پیدائش:

شیخ ”برھان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل بن خلیل بن ابی بکر الصدیق الفر غانی المرغینانیؒ“ ہیں۔ مصنفؒ کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی اور نسبی شرافت سے بھی نوازا۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

”مرغینان“ ماوراء النہر کے علاقہ میں ولایتِ فرغانہ کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جو دریائے سیحون کے جنوب میں واقع ہے۔ اسی بستی کی نسبت سے آپ ”مرغینانی“ کہلاتے ہیں۔ ”فرغانہ“ ماوراء النہر میں ہے، یہ جگہ اس وقت وسطی ایشیاء کے ملک ازبکستان میں ہے۔ مرغینان: فرغانہ کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر ہے، جسے اب ”مرغلان“ کہا جاتا ہے، اور یہ ترکستان کے قریب واقع ہے۔ ۸/ رجب المرجب ۵۱۱ھ کو بروز پیر بعد نمازِ عصر اسی علاقے میں آپ کی پیدائش ہوئی۔

تحصیلِ علم اور اساتذہ:

مصنفؒ کے زمانے میں علم کسی ایک مدرسہ میں داخلہ لے کر حاصل نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اہلِ علم و فضل کی اپنی اپنی مسندیں تھیں جہاں وہ درس دیتے تھے دور دراز سے طالبانِ علوم آکر ان میں شریک ہوتے تھے۔ اور کسی ایک استاذ یا ایک مجلسِ درس پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ جہاں جو شخص جس فن کا ماہر ملتا وہاں چلے جاتے کئی کئی برس اس کی خدمت میں رہتے اور اس کے علم و فضل سے پوری طرح مستفید ہوتے۔ اس زمانے میں تعلیم سفر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، اُس زمانے کے رواج کے مطابق آپ نے اولاً اپنے علاقے میں علم حاصل کیا ہوگا، یہاں سے سیرابی کے بعد مختلف اسلامی ممالک کا سفر اختیار کر کے جو صاحبِ علم جہاں ملا وہاں اس سے استفادہ کیا ہوگا۔

دکتور بکداش لکھتے ہیں: مرغینانیؒ نے مختلف قسم کے علوم حاصل کیے، خصوصاً فقہ کو بڑے بڑے ائمہ کی جماعت سے سیکھا۔ وہ ان کے پاس سفر کر کے گئے، ان سے براہِ راست علم حاصل کیا، ان کی زبانی سنا، اور ان سے اجازت حاصل کی۔ حتیٰ کہ خود مرغینانیؒ نے فرمایا: ''میں نے بہت سے بڑے مشائخ کو پایا، مگر ان سے دریافت نہیں کیا۔'' اسی طرح وہ بیت اللہ الحرام کے حج اور نبی ﷺ کی زیارت کی سعادت سے بھی ۵۴۴ھ میں مشرف ہوئے، اور وہاں حرمین شریفین میں موجود بڑے بڑے علما سے ملاقات کر علم حاصل کیا۔ مزید یہ کہ مرغینانی نے اپنی ذاتی ایک ''مشیخہ'' مرتب کی، جس میں اپنے تمام شیوخ کے نام اور ان کے حالات اسی طرز پر درج کیے جس طرح محدثین اپنی مشیخات لکھا کرتے تھے۔

ان جلیل القدر ائمہ میں، جن سے امام مرغینانیؒ نے علم حاصل کیا:

(۱) آپ کے والد امام ابوبکر بن عبدالجلیل المرغینانی بھی شامل ہیں، (۲) آپ کے نانا امام قاضی عمر بن حبیب الزرندرامشی تھے۔ اسی طرح ان کے اساتذہ میں یہ نام بھی نمایاں ہیں: (۳) امام علی بن محمد الاسیجابی (متوفی ۵۳۵ھ) جو مختصر الطحاوی کے شارح تھے۔ (۴) نجم الدین ابو حفص عمرو بن محمد بن احمد النسفیؒ (م ۵۳۷ھ-۱۱۴۲ء) جو امام نسفی کے نام سے مشہور ہیں۔ عقائد کے موضوع پر ایک مختصر کتاب لکھی، علّامہ تفتازانی (م ۷۹۲ھ) نے اس کی شرح لکھی جو ''شرحِ عقائد'' کے نام سے مشہور ہے۔ (۵) امام صدر الشہید عمر بن عبدالعزیز بن مازہ (متوفی ۵۳۶ھ)۔ (۶) اسی طرح انہوں نے سنن الترمذی امامِ محدث، شیخ الاسلام ضیاء الدین ابو محمد صاعد بن أسعد المرغینانی سے پڑھی۔ (۷) امام ظہیر الدین ابو المحاسن الحسن بن علی المرغینانی (جو بخارا سے تعلق رکھتے تھے) سے اجازت حاصل کی۔ (۸) ابو عمرو عثمان بن علی البیکندی (م ۵۵۲ھ - ۱۱۵۷ء) فقہِ حنفی کی معروف و ضخیم کتاب ''المبسوط'' کے مصنف شمس الائمۃ محمد بن احمد بن ابی سہل ابی بکر السرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) کے شاگرد ہیں۔

مزید برآں، محب الدین ابن الشحنۃ الحلبی (متوفی ۸۹۰ھ) نے اپنی کتاب ''نهاية النهاية شرح الهداية'' میں ذکر کیا ہے کہ: امام مرغینانیؒ کے اساتذہ میں ایک امامِ مشہور قاضی خان الحسن بن منصور الاوزجندی (متوفی ۵۹۲ھ) بھی تھے، جن کی وفات مرغینانیؒ سے صرف ایک سال پہلے ہوئی۔ ابن الشحنۃ نے فرمایا: وقد أخذ عنه الفقه۔

تلامذہ:

علّامہ عبدالحیّ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں: ''وتفقَّه عليه جمٌّ غفيرٌ منهم أولاده ''کہ آپ سے ایک بڑی جماعت نے فقاہت حاصل کی، جن میں آپ کی اولاد بھی شامل

ہے۔ آپ کے تین فرزند تھے، تینوں اپنے دور کے امام تھے: شیخ الاسلام عماد الدین ابی بکر، نظام الدین عمر الفرغانی، ابوالفتح جلال الدین محمد الفرغانی رحمہم اللہ۔ صاحبِ ہدایہ کے پوتے امام ابوالفتح زین الدین عبد الرحیم بن ابی بکر عماد الدین بن علی برہان الدین المرغینانی بھی آپ کے شاگرد ہیں، یہ مشہور کتاب "الفصول العمادية" اور "الفصول الأستروشنية" کے مصنف ہیں۔

دکتور بکداش لکھتے ہیں: جہاں تک ان کے شاگردوں، ان سے علم حاصل کرنے والوں اور ان کے دستِ فیض سے فقہ حاصل کرنے والوں کا تعلق ہے، تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اتنی کہ شمار کرنا مشکل ہے۔

ان میں سے ایک عظیم شخصیت جنہوں نے ان سے بہت استفادہ کیا، ان کے زیرِ تربیت ہوئے، اور جنہوں نے کتاب "الهداية" کو ان سے روایت کیا، وہ ہیں امام شمس الائمہ محمد بن عبد الستار الکردري المعروف بہ "خواہر زادہ" (وفات: ۶۴۲ھ)۔ بعض اہلِ علم فرماتے ہیں: سب سے پہلے ہدایہ صاحبِ ہدایہ سے پڑھنے والے یہی شمس الائمہ الکردریؒ ہیں، اس کے بعد سے برابر اس کا درس جاری ہے، اور کوئی عالم و مفتی اس سے بے نیاز نہیں ہے۔

علّامہ مرغینانیؒ کے بارے میں علماء کی آراء و تحسینات:

علّامہ لکھنویؒ نے آپ کے ترجمہ کا آغاز "الفوائد البهية" میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

كان إماماً، فقيهاً، حافظاً، محدثاً، مفسراً، جامعاً للعلوم،ضابطاً للفنون، متقناً، محققاً، نظاراً، مدققاً، زاهداً، ورعاً، بارعاً، فاضلاً، ماهراً، أُصولياً، أديباً،

شاعراً، لم تر العيونُ مثلَه فی العلم والأدب و له اليد الباسط فی الخلاف والباع المُمتد فی المَذاهب.

یعنی شیخ برہان الدین مرغینانی اپنے وقت کے امام، عظیم المرتبت فقیہ، حافظِ حدیث، مفسر، مختلف علوم وفنون کے جامع، صاحبِ ورع وتقویٰ، عابد وزاہد اور محقق تھے، علم وادب کے مختلف گوشوں پر وسیع اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ علمِ خلافیات میں بلند مرتبہ پر فائز تھے اور فقہی مذاہب پر مجتہدانہ دسترس رکھتے تھے۔

مرغینانیؒ علم وفضل کے اس بلند مقام پر پہنچے کہ اس زمانہ کے مشائخ اور اکابر فقہاء نے ان کی علمی عظمت وبرتری کا اعتراف کیا۔ مثلاً: امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)، قاضی خان (م ۵۹۲ھ)، ظہیر الدین بخاری (م ۶۱۹ھ) صاحبِ "فتاویٰ ظہیریہ" جیسے اکابر نے مرغینانیؒ کو اپنے دور کا بے مثال محقق، فقیہ اور اصولی تسلیم کیا ہے۔

ذہبی ان کے حالات میں فرماتے ہیں: العلّامة عالم ماوراء النهر ... لم تبلغنا من أخباره و كان من أوعية العلم رحمه الله. (سِيَر أعلام النبلاء:۲۱/۲۳۲) یعنی علامہ، ماوراء النہر کے عالم... ہمیں ان کے حالات (کی تفصیل) معلوم نہیں، (البتہ اتنا ہے کہ) علم کے ظروف میں سے تھے۔ قرشی کہتے ہیں: أقرَّ له أهل مصر بالفضل والتقدم... تفقَّه على جماعة... فاق شيوخه وأقرانه وأذعنوا له كلهم ... وتفقه عليه الجمُّ الغفير. (الجواهر المضية:۱/۳۸۳) اہلِ مصر نے ان کے کمال اور برتری کا اعتراف کیا ہے... ایک جماعت سے فقہ (کی مہارت لی)... اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں سے آگے نکل گئے اور ان سب نے ان کی برتری تسلیم کی ہے... بہت بڑی جماعت نے ان سے فقہ (کی مہارت) لی ہے۔

کفوی کہتے ہیں: كان إماماً، فقيهاً، حافظاً، محدثاً، مفسراً، جامعاً للعلوم، ضابطاً للفنون، متقناً، محققاً، نظاراً، مدققاً، زاهداً، ورعاً، بارعاً، فاضلاً، ماهراً، أُصولياً، أديباً، شاعراً، لم تر العيونُ مثلَه فى العلم والأدب و له اليد الباسط فى الخلاف والباع المُمتد فى المَذاهب.

وہ امام، فقیہ، حافظ، محدث، مفسر، علوم کے جامع، فنون کے ماہر، متقن، محقق، مناظر، باریک بین، زاہد و پرہیز گار، فائق الاقران، فاضل ماہر، فائق ماہر، اصولی، ادیب، شاعر تھے، آنکھوں نے ان کے زمانے میں علم وادب میں ان جیسا نہیں دیکھا۔(كتائب أعلام الأخيار: ۲۲۰ مخطوط) حضرت کشمیری فرماتے ہیں: لا يدرك شأو صاحب الهداية في فقهه ألف فقيه مثل صاحب الدر المختار؛ فإنَّ صاحب الهداية فقيه النفس، علمُه علم الصدر، وعلم صاحب الدر المُختار علمُ الصحف والأسفار وأنَّ البَوْنَ بينهما لبعيد. (تقدمة البنوری علی نصب الراية: ۱٤) یعنی صاحبِ دُرِّ مختار جیسے ہزار فقیہ بھی صاحبِ ہدایہ کے درجے کو نہیں پہنچتے کیوں کہ صاحبِ ہدایہ فقیہ النفس ہیں اور ان کا علم سینے کا علم ہے اور صاحبِ دُرِّ مختار کا علم کتابی ہے اور ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

دکتور بکداش لکھتے ہیں: امام مرغینانیؒ کے فضل و برتری کا اعتراف آپ کے اساتذہ، ہم عصر علما، ہم زمانہ نیک اور فاضل اشخاص، بلکہ بعد کے علما و فضلا نے بھی کیا ہے۔ یہ حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ امام مرغینانیؒ نے اپنے اساتذہ اور ہم عصروں سب پر علم و فضل میں برتری حاصل کی، اور سب کے سب ان کے علم و فضیلت کے قائل و معترف ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود امام مرغینانی نے اپنے بارے میں فرمایا: ”میں اپنے ہم عصروں پر اس بات کی وجہ

سے فائق ہوا کہ مجھے علم حاصل کرنے میں کبھی سستی یا رکاوٹ پیش نہیں آئی"۔ (الفوائد البھیۃ)

امام علّامہ سعدیؒ (وفات ۹۴۵ھ) نے آپ کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے: الشيخ الإمامِ العالِمِ برهان الإسلام والمسلمين، مفتي الشام والصين، حُجَّةِ اللهِ الحَقِّ على الخَلْق: أبي الحسن علي بن أبي بكر المرغيناني الرشداني.

علامہ جمال الدین ابن مالک (وفات ۶۷۲ھ) نے فرمایا: "صاحبِ ہدایہ، امام مرغینانی، آٹھ علوم میں مہارت رکھتے تھے۔"

اور آٹھ علوم سے مراد وہ علوم ہیں جن کے ذریعے منصبِ اجتہاد حاصل ہوتا ہے، یعنی:

(۱) علمِ قرآن (کتاب اللہ کی معرفت) (۲) علمِ سنّت (حدیثِ نبوی کی معرفت) (۳) علمِ اجماع (۴) علمِ عقل و قیاس (۵) علمِ حدّ و برہان (منطق و استدلال کا علم) (۶) نحو، لغت اور تصریف کی معرفت (۷) علمِ ناسخ و منسوخ اور اسبابِ نزول کا علم (۸) علمِ جرح و تعدیل اور رواۃِ احادیث کے احوال کا علم۔

وفات:

آپ کی وفات ۵۹۳ھ-۱۱۹۷ء میں مورخہ ۱۴/ ذی الحجہ منگل کی شب کو ہوئی۔ دکتور بکداش لکھتے ہیں: یوں علم و عمل سے بھرپور ایک عمر گزارنے کے بعد امام المرغینانی رحمۃ اللہ علیہ منگل کی رات، ۱۴/ ذی الحجہ ۵۹۳ھ کو وفات پاگئے۔ جعل الله له لسان صدق فى الآخرين

تدفین:

آپ کو سمرقند (جو آج کل جمہوریہ ازبکستان میں واقع ہے) میں دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار آج بھی ظاہر و معروف ہے۔

امام قرشی نے اپنی کتاب ''الجواھر المُضیئة'' کے مقدمے میں امام مرغینانی کے مدفن کے بارے میں فرمایا: مجھے ہمارے معتبر ساتھیوں میں سے ایک نے -جو مختلف بلاد کا سفر کر چکا تھا- بتایا کہ سمرقند میں ایک بڑی بستی ہے جس کا نام ''جاکر دیزہ'' ہے، وہاں ایک مشہور جگہ ہے جسے ''تُربةُ المُحمَّدِیِّین'' (یعنی محمد صاحبان کی قبرستان) کہا جاتا ہے۔ اس میں تقریبًا چار سو ایسے علماء مدفون ہیں جن کا نام محمد تھا۔ ہر ایک نے تصنیف و افتاء کا کام کیا اور ان سے بڑی تعداد نے علم حاصل کیا۔ ایک اور راوی نے یہ اضافہ کیا کہ ان میں سے ہر ایک کا نام محمد بن محمد تھا۔ اہلِ سمرقند نے ان سب کو اسی تربت میں دفن کیا تھا۔

پھر جب امامِ جلیل، صاحبِ ہدایہ (امام المرغینانی) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے آپ کو اسی تربت میں دفن کرنا چاہا، لیکن وہاں اجازت نہ ملی، (کیوں کہ آپ کے نام میں ''محمد'' نہیں تھا) لہٰذا آپ کو اس کے قریب ہی دفن کیا گیا اور آج تک تربت المحمدین سمرقند میں معروف و مشہور ہے۔

اخلاص واخلاق:

ہدایہ کی تلخیص میں آپ کو کافی وقت لگا، تیرہ برس کی شبانہ روز محنت کے بعد فقہِ اسلامی کی یہ عظیم الشان کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مصنفؒ اس پوری مدّت میں (ایامِ ممنوعہ کے علاوہ) مسلسل روزہ دار رہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں کسی کو یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ وہ مسلسل روزہ رکھتے ہیں، ہر روز جب خادم کھانا لے کر آتا تو اسے کہتے کھانا رکھ دو، وہ کھانا رکھ کر چلا جاتا، اس کے جانے کے بعد طلباء میں سے کسی کو کھلا دیتے۔ خادم جب برتن لینے آتا تو انہیں خالی دیکھ کر یہ سمجھتا کہ شیخ کھانے سے فارغ ہو گئے ہیں۔ تیرہ برس تک اخلاص و تقویٰ کے اس اعلیٰ مقام کو

چھپائے رہے۔ لیکن قدرت کا نظام ایسا ہے کہ بندہ اپنے نیک و بد اعمال کو کتنا ہی چھپائے اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کر ہی دیتا ہے۔

مذہب میں ان کا مقام:

حنفی فقہاء نے فقہاء کو سات طبقات میں تقسیم کیا ہے، جیسا کہ ابنِ کمال احمد بن سلیمان پاشا نے اپنے ایک رسالہ میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صاحبِ ہدایہ (امام المرغینانی) کو پانچویں طبقے میں شمار کیا ہے، جو اصحابِ ترجیح میں سے ہے۔ البتہ لکھنویؒ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی خان کو تیسری درجے میں رکھنا اور قدوری اور صاحبِ ہدایہ کو اس سے نیچے رکھنا یہ بات مناسب نہیں۔

ایک سوانح نگار لکھتے ہیں: ابنِ کمال پاشا نے مرغینانی کو ان ابتدائی تین طبقوں میں شمار نہیں کیا ہے۔ جو مجتہدین کے طبقے ہیں، بلکہ فقہاء کے چوتھے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ یعنی اصحابِ تخریج میں جو خود ان کے قول کے مطابق فقہا مقلدین کا پہلا طبقہ ہے۔ ان کی اس تقسیم اور رائے پر علمائے احناف نے سخت تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ علمِ فقہ میں صاحبِ ہدایہ کا رتبہ قاضی خان سے کم نہیں ہے بلکہ صاحبِ ہدایہ نے ہدایہ میں نقدِ دلائل اور استخراجِ مسائل میں جو اسلوب اور معیار قائم کیا ہے اگر اس پر نظر کی جائے تو وہ اس بات کے مستحق نظر آتے ہیں کہ انہیں مجتہد فی المذاہب مانا جائے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کا رجحان اسی طرف ہے، "الفوائد البهية" میں انہوں نے اسی رائے اور میلانِ طبع کا اظہار کیا ہے۔

تصانیف:

اہلِ علم کی جلالتِ شان اور علمی قدر و منزلت کا اندازہ ان کی تصنیفوں اور تالیفوں سے

بخوبی ہوجاتا ہے۔ اس لیے سوانحی خاکہ میں اس کو بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے۔ امام مرغینانیؒ نے درسی افادہ کے ساتھ ساتھ کئی شاہ کار آنمٹ کتابی نقوش چھوڑے ہیں۔ جن کی تعداد گنتی میں اگرچہ زیادہ نہیں ہے، لیکن جامعیت، نافعیت اور کیفیت میں کئی صفحات پر بھاری ہیں۔ جب کہ آپ کی ایک کتاب "ہدایہ" جس کی تلخیص ہے، یعنی "كفاية المنتهى" وہ کمیت میں بھی بہت فائق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسّی (۸۰) جلدوں میں تھی۔ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے آپ کی جن تصانیف کی نشاندہی کی ہے ان کی تعداد گیارہ ہیں اور وہ سب کی سب فقہ کے موضوع پر ہیں۔

(۱) "بداية المبتدى": اس کتاب میں قدوری اور امام محمدؒ کی جامع الصغیر کے مسائل کو جمع کیا اور ان میں بعض ضروری مسائل اور احکام کا اضافہ کیا۔ تبرک کے طور پر کتاب کے مضامین کی ترتیب وہی رکھی جو امام محمدؒ نے جامع الصغیر میں رکھی تھی۔

(۲) "كفاية المنتهى": "بداية المبتدى" کے نام سے ایک جامع متن کی تصنیف کے بعد اپنے ارادہ اور وعدہ کے مطابق اس کی بسیط شرح لکھی جسے "كفاية المنتهي" کے نام سے موسوم کیا۔ تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ کتاب اسی (۸۰) جلدوں یا اسی (۸۰) اجزاء پر مشتمل تھی لیکن اس کا مسودہ زیادہ دیر اہلِ علم وفضل کے احاطۂ علم میں نہ رہ سکا اور بعد میں آنے والوں کے لئے اس کے صرف حوالے ہی رہ گئے۔ اسی عظیم الشان اور ضخیم شرح کی تلخیص "الهداية" ہے۔

(۳) نشر المذاهب (۴) مجموع النوازل (۵) مختار الفتاویٰ (۶) الفروع (۷) كتاب الفرائض (فرائض العثمانی) (۸) التجنيس والمزيد: اس کتاب میں متاخرین

فقہاء کیے وہ فقہی استنباطات اور اجتہادات جمع کئے ہیں جو فقہائے متقدمین نے بیان نہیں کئے تھے۔(۹) مناسك الحج(۱۰)شرح جامع الكبير۔

(۱۱)''الهداية'': مرغینانی کی تمام تصانیف میں جو مقام اور رتبہ ہدایہ کو ملا وہ کسی دوسری تصنیف کو نہ مل سکا۔ مرغینانی نے پہلے ''بداية المبتدي'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کے بعد اس کی مفصل شرح لکھی، کفایۃ المنتہٰی کی تکمیل کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اتنی ضخیم کتاب کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اہلِ علم کے لئے دشواری کا سبب ہوگا۔ اس کی ایسی تلخیص کی جائے کہ اہم اور ضروری مسائل کا احاطہ بھی ہو جائے اور اس کی تعلیم اور تعلم بھی آسان ہو چنانچہ انہوں نے اسی (۸۰) اجزاء پر مشتمل مضامین کو چار مناسب جلدوں میں مختصر کیا۔ لیکن چار جلدوں میں ہونے کے باوجود ٹھوس، جامع اور مختصر متن کی طرح اس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ تفصیل اور وضاحت کا محتاج ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب اسی (۸۰) جلدوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہوگی اس کی عبارت انتہائی جامع ہوگی۔ اور کم الفاظ اور مختصر جملوں میں معانی اور مطلب کا سمندر موجزن ہوگا۔

شانِ ہدایہ علمائے ذی شان کی زبانی:

مولانا محمد نعمان لکھتے ہیں: امام مرغینانی کی تمام تصانیف میں سے جو شہرت و قبولیت اور منفرد مقام الہدایہ کو حاصل ہوا کسی اور کتاب کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہ کتاب در اصل علّامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی تبحر، بصیرت، تحقیق و تدقیق، وسعتِ مطالعہ، صلابتِ رائے، فکری وفنی پختگی اور اجتہادی ملکہ و ثقاہت کا ایسا کامل ثبوت ہے کہ آج تک اس کی افادیت میں کمی واقع نہیں ہو سکی۔ تقریباً ۸۰۰/ سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کا مقام قانونی

دنیا میں بلند و بالا ہی ہے۔ ہر دور کے علماء، فقہاء اور ماہرینِ قانون اس سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اس سے بہتر، جامع و مانع، مدلل و مربوط اور موجز متن تاریخِ فقہ و قانون میں آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ علّامہ مرغینانیؒ نے الہدایہ کی تالیف کا آغاز ۵۷۳ھ ماہ ذی القعدہ میں بروز بدھ وقت ظہر کیا تھا۔ ہدایہ کو علّامہ مرغینانیؒ نے نہایت زہد و تقویٰ، اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تیرہ (۱۳) سال کے عرصے میں مسلسل روزے کی حالت میں لکھا۔

یہ محض اللہ تعالی کا فضل و کرم اور اس کا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاحبِ ہدایہ کی اس کتاب کو وہ مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی جو دیگر مصنفین و مؤلفین کے حصے میں نہ آسکی، بلاشبہ ہدایہ فقہِ حنفی کا جزءِ لاینفک ہے، اور حنفی کتابوں میں اسے ایک معتبر اور معتمد متن کی سند اور حیثیت حاصل ہے۔

ہدایہ کی یہ مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی اور جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا ہدایہ کے حوالے سے طالبینِ دینِ متین کا شغف اور ان کی چاہت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے کبھی گمراہی اور بے راہ روی کا شکار نہیں ہوسکتے، اور غور وفکر سے پڑھنے والے اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ان کے اندر خود اعتمادی اور دوسرے کلام کے صحیح معانی و مطالب اخذ کرنے کی خوبی پیدا ہوجاتی ہے۔

امام عماد الدین ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ الہدایہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

كِتَابُ الْهِدَايَةِ يَهْدِي الْهُدَى   إِلَى حَافِظِيهِ وَيَجْلُو الْعِمَى

فَلَازِمْهُ وَاحْفَظْهُ يَا ذَا الْحِجَى   فَمَنْ نَالَهُ نَالَ أَقْصَى الْمُنَى

ترجمہ: ہدایہ کی کتاب ہدایت دیتی ہے، اس کے حفظ کرنے والے کے اندھے پن کو دور کرتی ہے۔ اے عقل والے! اس کو لازمی پکڑ اور اسے یاد رکھ۔ پس جس نے اسے پالیا اُس نے خواہشات کی حدوں کو پالیا۔

علامہ عینیؒ اپنی شرح میں رقم طراز ہیں:

إن كتاب "الهداية" قد تباهجت به علماء السلف وتفاخرت به فضلاء الخلف حتى صار عمدة المدرسين في مدارسهم، وفخر المصدرين في مجالسهم، فلم يزالوا مشتغلين به في كل زمان ويتدارسونه في كل مكان، وذلك لكونه حاوياً لكنز الدقائق، وجامعاً لرمز الحقائق، ومشتملاً على مختار الفتاوي، ووافياً بخلاصة أسرار الحاوي، كافياً في إحاطة الحادثات، وشافيا في أجوبة الواقعات مؤصلاً على قواعد عجيبة، ومفصلاً على قواعد غريبة ومؤسساً على أصول مبنية، وفصول رصينة، ومسائل غزيرة، ودلائل كثيرة، وترتيب أنيق، وتركيب حقيق.

تَباهَجَت به: اس پر فخر کیا، اس کی شان وعظمت پر خوشی ظاہر کی۔ فَخر المصدّرين: وہ کتاب جس پر پیش رو علما فخر کرتے ہیں۔ حاوياً لكنز الدقائق: باریکیوں کے خزانے کو سمیٹے ہوئے۔ جامعاً لرمز الحقائق: حقیقتوں کے اسرار و رموز کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے۔ مختار الفتاوى: منتخب فتوے، چنی ہوئی شرعی آراء۔ مؤصَّلاً على قواعد عجيبة: نہایت عجیب و دقیق اصولوں پر مضبوطی سے قائم۔ مفصَّلاً على قواعد غريبة: انوکھی (نادر) علمی بنیادوں پر تفصیل سے مرتب۔ مؤسَّساً على أصول مبنية: مضبوط علمی اصولوں پر تعمیر شدہ۔ فصول رصينة: مضبوط و مستحکم ابواب۔ مسائل غزيرة: بے شمار و بھرپور مسائل۔

ترتیب أنیق: خوبصورت و منظم ترتیب۔ ترکیب حقیق: بامعنی اور پختہ اسلوبِ بیان۔

برہان الشریعہ محمود بن صدر الشریعہ نے اپنی کتاب ''الوقایة'' کے مقدمے میں ہدایہ کے بارے میں فرمایا: ''یہ ایک نہایت اعلیٰ کتاب ہے، علم کا موجزن سمندر ہے، جلیل القدر اور عظیم الشان تصنیف ہے، اعلیٰ مرتبت اور روشن دلیلوں والی کتاب ہے۔ اس کی خوبیاں کامل ہیں، اس کی برکتیں عام ہو چکی ہیں، اور اس کی نشانیوں (دلائل و اثرات) نے سب کو حیران کر دیا ہے۔''

امام قوام الدین کاکی محمد بن محمد السنجاری (متوفی ۷۴۹ھ) نے اپنی کتاب ''معراج الدراية في شرح الهداية'' کے مقدمے میں ہدایہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اس فن (فقہ) میں جتنی باتیں جمع کی جا سکتی تھیں، سب کو جامع ہے۔ علمِ درایت کے فنون اور عمدہ روایتیں سب اس میں موجود ہیں۔ اس کی حقیقت صرف وہی جان سکتا ہے جو فکر کو خالص کرے (یعنی خوب غور کرے) اور نظر کو باریک کرے (یعنی گہرائی سے دیکھے)۔ اس کی شرحیں علما و شارحین نے لکھی ہیں، اور اس کی تدریس میں مشائخِ محققین مشغول رہے ہیں۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۵۲ھ) فرمایا کرتے تھے:

چاروں فقہی مسالک میں فقہاء نے بہت کتابیں لکھیں اور ان میں بعض مضامین اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ ہیں لیکن ہدایہ جیسی کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ حسنِ ترتیب اور حسنِ بیان دونوں کے اعتبار سے ہدایہ بے مثال کتاب ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ فتح القدیر جیسی کتاب لکھ دو تو مجھے امید ہے کہ میں لکھ سکوں گا لیکن اگر کوئی

ہدایہ جیسی کتاب لکھنے کے لئے کہے تو شاید میں چند سطریں بھی نہ لکھ سکوں۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حضرت انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ الحمدللہ! میں ہر کتاب کے مخصوص طرز پر کچھ نہ کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن چار کتابیں اس سے مستغنی ہیں: قرآنِ عزیز، بخاری شریف، مثنوی اور ہدایہ۔

علّامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جلالتِ شان سے جو واقف ہیں وہ ان کے اس قول کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبِ ہدایہ کی وفات پر آٹھ صدیاں گزرنے کو ہیں مگر ہدایہ آج بھی اس طرح نصاب میں باقی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ جن مقاصد کے پیشِ نظر یہ کتاب نصاب میں داخل کی گئی ہے فقہِ حنفی میں کوئی دوسری کتاب اب تک ایسی تصنیف ہی نہیں ہوئی جو اس کے قائم مقامی ہو سکے۔

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۴ھ) نے سراج الہدایہ کے آغاز میں ہدایہ کے بارے میں یہ کلمات تحریر کیے، ان کا یہ جملہ ہدایہ کی ایک منفرد خصوصیت کی نشاندہی کر رہا ہے:

دریا کی ظاہری سطح پر تیرنے سے موتی ہاتھ نہیں آتے۔ موتی اس کے ہاتھ لگتے ہیں جو دریا کی گہرائی تک غوطہ لگانے کی قدرت رکھتا ہو، ان جیسے راسخین فی العلم میں سے شیخ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، جنہوں نے شرائعِ اسلام یعنی احکامِ شرعیہ کی تحقیق و تدقیق پر ہدایہ کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی، جو احکامِ شرعیہ کی تحقیق و تدقیق اور علم کی گہرائی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ہر مسئلہ پر ائمۂ اربعہ کے اقوال اور ہر قول کی ایک ایک دلیلِ نقلی اور ایک ایک دلیلِ عقلی بیان کی۔ پھر آخر میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ایک دلیلِ نقلی اور ایک دلیلِ

عقلی بیان کرنے کے بعد ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ کی ہر دلیلِ نقلی اور دلیلِ عقلی کا جواب دیا۔ اس طرح بسا اوقات تین اماموں کی چھ دلیلیں اور ان کے چھ جواب مل کر بارہ ہوتے ہیں اور دو دلیلیں ابو حنیفہ کی اور ایک وجہِ ترجیح سب مل کر پندرہ دلائل کا ذخیرہ چند سطروں میں سامنے آجاتا ہے اور قاری پر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ (بحوالہ اصولِ ہدایہ)

مفتی محمد عاشق الٰہی برنی (م ۱۴۲۲ھ) علّامہ عینی کی ''البناية'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''فقہ کی کسی بھی کتاب (چاروں مذاہب میں سے) کو وہ خدمت اور توجہ نہیں ملی جو کتاب ''ہدایہ'' کو حاصل ہوئی۔ اور نہ ہی فقہاء، محدثین اور مضبوط حفّاظ اس بات پر کسی دوسری فقہی کتاب کے بارے میں اس طرح متفق ہوئے جیسے ہدایہ کے بارے میں ہوئے۔ یہی غیر معمولی قبولِ عام اور علمائے اُمّت کا اس کتاب کو خلوص کے ساتھ اپنانا اس کی عظمت کے لیے کافی دلیل ہے۔

اس کے شارحین میں فقہاء و محدثین کے اکابر اور دور کے اجلّہ علما شامل ہیں، جیسے: حافظ عینی، قوام الدین اتقانی، قوام الدین کاکی، ابن الہمام سیواسی۔ اور اس کے مخرجین (احادیث کی تخریج کرنے والے) جلیل القدر حفاظ میں شامل ہیں، جیسے: المارديني، الزيلعي، القرشي، ابن حجر، القاسم بن قطلوبغا الحنفي۔ پس صرف اتنا ہی اس کتاب کی فضیلت و شرف کے لیے کافی ہے کہ اس کے شارحین اور مخرجین ایسے بلند پایہ علما ہوں۔ تو کیا ایسی خصوصیت کسی دوسری کتاب کے لیے برابری یا مقابلہ کر سکتی ہے؟!

وما كلُّ مخضوب البنان بثينة   ولا كل مصقول الحديد

اور ہر مہندی لگی انگلیوں والی عورت ''بُثَيْنَة'' نہیں ہوتی اور نہ ہر چمکتا لوہا ''یمنی تلوار'' ہوتا ہے۔

دکتور بکداش کئی قدیم جدید عربی عجمی علماء کے اقوالِ مدح نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: میں ان تعریفوں کو دو اور اشعار پر ختم کرتا ہوں جو کتاب الہدایہ کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ یہ دونوں اشعار پرانی خطی نسخوں کے آغاز میں اکثر ملتے ہیں، اور تقریباً ہر اس شخص نے نقل کیے ہیں جس نے ہدایہ پر لکھا ہے۔ میں شاعر کا نام نہیں پاتا، اس لیے کہ لوگ یوں ہی کہتے ہیں: وقيل فی مدحها كذا۔ میں بھی ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا ذکر کرتا ہوں، اگرچہ مجھے ان میں شعری مبالغہ دکھائی دیتا ہے۔

وہ اشعار یہ ہیں:

إن الهداية كالقرآن قدنسخت ما صنفوا قبلها فی الشرع من كتب

فاحفظ قواعدها واسلك مسالكها يسلم مقالك من زيغ ومن كذب

یعنی جس طرح قرآنِ کریم نے پچھلی تمام آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا اسی طرح ھدایہ بھی ان تمام فقہی کتب پر غالب آگئی جو اس سے پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے اصول و قواعد کو یاد کر لیجئے اور اس کے طریقہ کو اپنا لیجئے تو آپ کی گفتگو کجی اور جھوٹ سے محفوظ و مامون ہو جائے گی۔

ہدایہ کی نصابی اہمیت:

حضرت مفتی محمد تقی صاحب مد ظلہ ہدایہ کے بارے میں فرماتے ہیں: اس کتاب کو اگر درسِ نظامی کا حاصل اور علومِ دینیہ کی بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ لہٰذا اُستاذ کو اسی اہمیت کے ساتھ اسے پڑھانا چاہیے۔ کتاب کا مقصد یہ ہے کہ طالبِ علم کو مسائل کے ساتھ ان کے نقلی اور عقلی دلائل اور فقہاء کے مدارک استنباط سے واقفیت ہو۔

(درسِ نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں ؟:۳۸)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں: غور کیا جائے تو تعلیم کی غرض یہی دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی آدمی خود سوچنے لگے اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتیں سمجھنے لگے۔ اصولِ فقہ کی کتاب بزدوی، فقہ کی کتاب ہدایہ اور تفسیر کی کتاب کشاف درس میں ان ہی دونوں اغراض کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ہدایہ کی یہ خوبی نہیں کہ اس میں فقہ کے تمام مسائل آگئے ہیں اور ان مختصر جلدوں میں فقہ جیسے بحرِ ذُخّار کا سمانا مشکل کیا ناممکن ہے۔ لیکن دماغ کی جتنی ورزش اس کی عجیب وغریب سہل ممتنع عبارتوں سے ہو جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ اس مقصد کے لیے ہدایہ سے بہتر کتاب مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ اس لیے شاعر کا بیان مبالغہ نہیں کہ ہدایہ کے پڑھنے والے کج راہی اور غلط روی کے شکار نہیں ہو سکتے۔ خود صحیح سوچنے اور دوسرے کے کلام کے صحیح مطلب سمجھنے کا جتنا اچھا سلیقہ یہ کتاب پیدا کر سکتی ہے عام کتابوں میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ (نظامِ تعلیم وتربیت: ۱/ ۳۱۳، ۳۱۴ تلخیص)

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہدایہ صحیح طرح پڑھنے سے جو تحقیق و تدقیق کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اس کا کوئی متبادل نہیں۔ اور دوسرے حضرت نے ہدایہ کی عبارت کو سہل ممتنع کہا ہے۔ یہ ادب کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کے معنی ہیں آسان الفاظ میں ایسے لطیف معنی ادا کر دینا جنھیں اس طرح ادا کرنا ناممکن ہو۔ اردو میں مومن خاں مومن کا یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اکبر حسین صاحب جج اور ناظر حسن صاحب رامپوری وکیل کی قابلیت جو حکام میں بھی مسلم تھی، وہ عربی ہی کی بدولت تھی۔ چنانچہ وکیل صاحب نے خود کہا

کہ یہ جو وکالت میں میری نظر ایسی رسا ہے، یہ محض ہدایہ پڑھنے کی برکت ہے۔ (ملفوظاتِ حکیم الاُمّت: ۱۰/ ۳۷) اور فرمایا: آج کل عربی طلبہ بھی سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ طوطے کی طرح کتابیں رٹ لیتے ہیں، اس لیے ان میں سمجھ پیدا نہیں ہوتی۔ (ملفوظاتِ حکیم الاُمّت: ۵/ ۲۲۵)

حضرت مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: میں سپریم کورٹ میں شرعی جج کی حیثیت سے میں ۱۷/ سال رہا ہوں، شاید اتنی مدّت وہاں کوئی اور نہ رہا ہو۔ وہاں میری طرح طالبِ علم بھی ہوتے تھے اور وہ حضرات بھی ہوتے تھے جن کی ساری زندگی وکالت میں گزری۔ ہمارا کام مروجہ قوانین کا جائزہ لینا ہوتا تھا اور اس کی ایک ایک شق کو گہری نظر سے دیکھنا ہوتا تھا، وہاں ہمارے درمیان جو مقدمات آتے تھے تو (اس وجہ سے کہ جو میں نے بحیثیت طالبِ علم مدرسہ میں تعلیم حاصل کی) بات ذرا جلدی سمجھ میں آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ سب جج صاحبان بیٹھے ہوئے تھے، چیف جسٹس بھی وہاں موجود تھے۔ کسی قانون کی تشریح پر گفتگو ہو رہی تھی، تو میں نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اس کی تشریح در حقیقت کچھ یوں ہے، تو اس وقت چیف جسٹس نے کہا کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے ساری زندگی کبھی وکالت نہیں کی لیکن قانون کی بات آپ بہت تیزی سے پکڑتے ہیں! تو ایک دوسرے جج صاحب جو وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کہ: ہاں! انھوں نے ایل ایل بی کیا تھا اور دوسری پوزیشن حاصل ہوئی تھی، تو میں نے رد کیا کہ یہ ایل ایل بی کی وجہ سے نہیں ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ در حقیت میں نے ہدایہ پڑھی ہے۔ (اور الحمد للہ سمجھ کر پڑھی ہے اور بحمد اللہ فقہ اور اصولِ فقہ سے مناسبت بھی ہے۔ وہاں کی اعلیٰ تعلیم ہمارے اصولِ فقہ کے مقابلے میں بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔)

حضرت الاستاذ مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ (استاذ جامعہ ڈابھیل) لکھتے ہیں:

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے سابق صدر مفتی حضرت مولانا اسماعیل کچھولوی صاحب مدظلہ مجاز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا واقعہ ہے کہ احمد آباد میں ایک بدعتی نے مسجد کا صحن بیچ دیا، معاملہ عدالت تک پہنچا مفتی صاحب کو بھی طلب کیا گیا آپ نے بھری عدالت میں صحن کی بیع کے عدمِ جواز پر شرعی نقطۂ نظر سے بحث کی جج نے جب آپ کے دلائل سنے تو ہکا بکا رہ گیا اور کہنے لگا: یہ بتائیے کہ آپنے وکالت کی ڈگری کہاں حاصل کی؟ مفتی صاحب نے فرمایا: میں نے وکالت کی سند کہیں سے حاصل نہیں کی میں تو پرائمری اسکول میں صرف سات درجات پڑھا ہوں (انتہی)۔ یہ برکت تھی درسِ ہدایہ کی مفتی صاحب نے سالہا سال تک ہدایہ کا درس دیا ہے اس لئے دلائل پیش کرنے کے طرز اور جرح کے اصول اور طور طریق سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ احمد آباد کی بھری عدالت میں کامیابی ہوئی۔

(حاشیہ ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا تعارف)

حضرت الاستاذ مفتی قاضی حفظ الرحمان صاحب سملکی مدظلہ (استاذ جامعہ ڈابھیل) نے درس میں فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص ہدایہ جلد سوم پڑھالے تو پھر وہ سائنس وغیرہ کسی کی بھی تدریس کچھ تیاری کے بعد بخوبی کرسکتا ہے۔

کتاب ہدایہ کی خصوصیت: (از ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ کا تعارف)

علوم وفنون کی تاریخ میں یہ بات کم دیکھنے میں آئی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوتا رہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی کتاب کی بھی ایک مدت ہوتی ہے اور خاص وقت اور مدت گزرنے کے بعد کتاب کی اہمیت وافادیت کم ہو جاتی ہے لیکن ہدایہ کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی

ہجری میں لکھی گئی اور اب آٹھ صدیوں کی طویل مدت گزرنے کے بعد نہ اس کی اہمیت میں کوئی کمی واقع ہوئی اور نہ لوگ اس کی ضرورت سے بے نیاز ہوئے بلکہ گزشتہ نصف صدی سے اس کی ضرورت میں اضافہ ہوا ہے۔ بالخصوص ان مسلم ممالک میں جہاں نفاذِ اسلام اور احیائے اسلام کا عمل جاری ہے۔

ہدایہ کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اکثر علمی اور فنی کتابوں میں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ان کا ابتدائی حصہ زیادہ مشکل ہوتا ہے مسائل پر تفصیلی بحثیں بھی ابتدائی حصے میں زیادہ ہوتی ہیں۔ زبان اور اسلوبِ بیان پر بھی ابتدائی حصہ ہوتا ہے۔ بعض مصنفین تو ایسا دانستہ طور پر کرتے ہیں کہ قاری کتاب کا ابتدائی حصہ ضرور پڑھتا ہے اور اگر پوری کتاب پڑھتا ہے تو ابتدائی صفحات اور مباحث کو زیادہ توجہ کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اور یہ طبعی امر ہے کہ ابتدائی صفحات پڑھ کر قاری کے ذہن پر کتاب کے بارے میں جو نقوش اور تاثرات ثبت ہوتے ہیں وہ آخر تک قائم رہتے ہیں۔ مصنف اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنی اس آگاہی کا وہ پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ بعض مصنف غیر شعوری طور پر ایسا کرتے ہیں وہ کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کے ذہن میں بہت کچھ ہوتا ہے ابتداء میں وہ بہت پر عزم ہوتے ہیں اور اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زور بیان ابتداء میں ہوتا ہے وہ آگے چل کر باقی نہیں رہتا اور آہستہ آہستہ ان کا قلم دھیما دھیما ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور کتاب کا ایک تہائی حصہ پڑھ لینے کے بعد قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چڑھائی ختم ہوگئی ہے۔ اور اب وہ کسی ڈھلان پر ہے۔ اور اوپر سے نیچے کی طرف جا رہا ہے۔ ہدایہ اس خصوصیت میں منفرد ہے کہ مضمون جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے ہر لحاظ سے اتنا ہی دقیق اور مشکل ہوجاتا ہے۔

ایک خصوصیت یہ ہے کہ چاروں فقہی مسالک کی جو نمائندہ کتب لکھی گئیں اوّل تو ان میں صرف اپنے مسلک کا بیان، اس کی وضاحت او دلائل ہیں، دوسرے فقہی مسالک ان میں ذکر نہیں کئے گئے۔ مثلاً فقہِ مالکی میں ابنِ رشد قرطبیؒ (م۵۹۵ھ) کی ''بداية المجتهد'' یہ کتاب اصلاً فقہِ مالکی کی نمائندگی کرتی ہے۔ مالکی مسلک کی اہم اور بنیادی کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ ایک بلند کتاب ہے اس کے مصنف صاحبِ ہدایہ کے ہم عصر ہیں ان کا سالِ وفات (۵۹۳ھ) اور ابنِ رشد کا (۵۹۵ھ) ہے۔ ابنِ رشد بھی مالکی مذہب کے علاوہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمد حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کی آراء اور ان کا نقطۂ نظر بھی بعض مسائل میں بیان کرتے ہیں بلکہ مالکی مسلک اور باقی تین مسلّمہ فقہی مسالک کے علاوہ بعض ایسے فقہاء کے اقوال اور آراء بھی نقل کرتے ہیں جن کی طرف کوئی مسلک منسوب نہیں یا جنہوں نے کسی فقہی مسلک کی بنیاد نہیں رکھی۔ لیکن صاحبِ ہدایہ کی طرح ان مسالک اور آئمہ کے دلائل اور پھر جوابِ دلائل بیان نہیں کرتے۔ ایسی ہی ایک اور کتاب، ابنِ قدامہ مقدسی (م ۶۲۰) کی ''المغنی''، بھی ہے یہ فقہِ حنبلی کی نمائندگی کرتی ہے لیکن بعض مسائل میں نہ صرف باقی تین فقہی مسالک کا نقطۂ نظر بھی بیان کرتی ہے۔ بلکہ دوسرے غیر صاحبِ مسلک فقہاء کی آراء اور ان کے اقوال و فتاویٰ کا بھی اس میں خاصا ذخیرہ مل جاتا ہے۔ لیکن ہدایہ کا اسلوب اور طرزِ استدلال ان دونوں کتابوں میں سے کسی میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اپنے علاوہ دوسرے مسالک کا نقطۂ نظر ان کے دلائل کے ساتھ پیش کرنا اور پھر ان دلائل کا جواب دینا یہ صرف ہدایہ کی خصوصیت و انفرادیت ہے۔

ہدایہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فرد کی زندگی کا بھی احاطہ ہے اور

جماعت کی زندگی کا بھی۔ ایک فرد کو بحیثیت مسلمان جتنے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے، ان سب کی تفصیل اس میں موجود ہے مثلاً عبادات، نکاح، طلاق، خلع، دیگر معاشرتی مسائل، خرید وفروخت، حوالہ، کفالہ، رہن، شفعہ وغیرہ۔ اور اجتماعی مسائل میں حدود، تعزیرات، دیت، قصاص، جہاد، عدالتی نظام، سیاسی وانتظامی امور، مضاربت اور مشارکت وغیرہ جیسے بنیادی مسائل کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

وجہِ تالیف:

ابتداء آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ علم فقہ میں ایک مختصر کتاب لکھی جائے جو مختصر ہو اور مسائل معتبرہ کو حاوی ہو، تو قدوری اور امام محمدؒ کی جامع الصغیر کے مسائل کو جمع کرکے "بداية المبتدى" نام رکھا، اس میں مسائل کی ترتیب تبرکاً جامع الصغیر کے مطابق رکھی۔ پھر تالیفِ ہدایہ کے بارے میں خود مصنفؒ کتاب کے مقدمہ میں یوں وضاحت کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ "بداية المبتدى" کے دیباچے میں میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ اس کی شرح کروں گا جس کا نام "كفاية المنتهى" ہوگا۔ چنانچہ اس کو شروع کر رہا ہوں۔ وعدہ میں گنجائش اور وسعت ہوتی ہے اور جب کہ میں فراغت کو پہنچا ہوں تو میں نے محسوس کیا ہے کہ اس میں کلام بہت طویل ہوگیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ طویل کلام کی وجہ سے اصل کتاب (بدایہ) ہی نہ چھوٹ جائے اس لئے مجھے دوسری شرح کی طرف اپنی توجہ منعطف کرنا پڑی جس کا نام "الهداية" رکھا۔ اس میں اللہ کی توفیق سے عمدہ روایات اور ٹھوس عقلی دلائل جمع کر رہا ہوں۔ اس کے ہر بات میں زوائد کو حذف کرنے کا ارادہ ہے اور طول بیان سے احتراز کی نیت ہے لیکن بایں ہمہ وہ ایسے اصول پر مشتمل ہوگی جن پر فروع متفرع ہوسکیں۔ (مقدمة الهداية)

اسلوبِ بیان:

ہدایہ ایک تلخیص ہے، اور تلخیص ظاہر ہے کہ تفصیل کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہدایہ جس موضوع سے متعلق ہے وہ ایک مشکل موضوع ہے، موضوع کی وسعت اور پیچیدگی نے اسے ایک فنی کتاب کا درجہ دے دیا ہے۔ ایسی کتاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا اس کے اسلوب بیان اور طرز ادا سے پوری طرح واقف ہو۔ اس کتاب میں جو اصطلاحات اور رموز و اشارات استعمال کئے ہیں ان کو بخوبی سمجھتا ہو۔ اس حقیت کے پیشِ نظر ان تمام اصطلاحات اور رموز و اشارات کی وضاحت کی جاتی ہے جو مصنفؒ نے ہدایہ میں اختیار کی ہیں۔ ان اصطلاحات اور اشارات کو اہل علم وفضل اور شارحینِ ہدایہ نے ”عاداتِ صاحب ہدایہ“ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

عاداتِ صاحبِ ہدایہ:

(ا) قال: ہدایہ میں متن کے طور پر جو عبارتین دی گی ہیں اور خط کشیدہ ہیں وہ یا توامام محمد بن حسن شیبانی کی جامع الصغیر کی عبارت ہے یا تو مختصر القدوری کی ہے، قال کے ذریعہ شیخ مرغینانیؒ اس کو ممتاز کرتے ہیں۔ اکثر مقامات پر شارحین ہدایہ نے بین السطور نشان دہی کردی ہے۔ قال سے قدوری کی عبارت مراد ہے یا جامع الصغیر کی۔ بعض مقامات پر قال رضي الله لکھتے ہیں اس سے خود مصنف مراد ہوتے ہیں۔ شارحینِ ہدایہ کا کہنا ہے کہ صاحبِ ہدایہ جس جگہ اپنی کوئی خاص رائے یا تحقیق بیان کی ہے وہاں اصل عنوان تھا: ”قال العبدالضعیف“ (بندۂ ناچیز کہتا ہے) لیکن مصنّف کے انتقال کے بعد ان کے تلامذہ نے کتاب کا املاء کرتے وقت ان تمام مواقع پر رضي الله لکھ دیا۔ سلفِ صالحین کی یہ عادت تھی کہ وہ کسرِ نفسی اور

تواضع کے سبب أقول (میں کہتا ہوں) لکھنا اور کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔

(۲) مشائخنا: یعنی ہمارے مشائخ، ہمارے بڑے، ہمارے اساتذہ، جس مقام پر صاحبِ ہدایہ نے مشائخنا کہا ہے وہاں اس سے ان کی مراد بخارا اور سمرقند اور ماوراء النہر کے مشائخ ہوتے ہیں۔ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ وہ اس سے صرف علمائے احناف مراد لیتے ہیں۔

(۳) فی دیارنا: ہمارے علاقہ میں ہمارے شہروں میں، اس سے سمرقند اور بخارا کے علاقے مراد ہوتے ہیں۔

(۴) کتاب: بعض شارحین کا کہنا ہے کہ لفظِ ''کتاب'' سے مختصر القدوری مراد لیتے ہیں جہاں ''الکتاب'' کہتے ہیں وہان اس سے عام طور پر امام محمدؒ کی جامع الصغیر مراد ہوتی ہے۔ صاحبِ کشف الظنون کہتے کہ الکتاب سے بھی متنِ قدوری مراد ہوتا ہے۔ بعض شارحین کا کہنا ہے کہ الکتاب سے بعض مقامات پر خود صاحبِ ہدایہ کا متن مراد ہوتا ہے۔ شارحینِ ہدایہ نے یہ بھی وضاحت کی کہ جس خط کشیدہ عبارت (متن) سے پہلے مرغینانی ''قال'' نہیں لکھتے وہ عبارت نہ جامع الصغیر ہوتی ہے نہ مختصر القدوری کی۔

(۵) الأصل: کسی مسئلہ اور عبارت کے بیان میں جہاں الأصل لکھ کر حوالہ دیتے ہیں، اس سے امام محمد بن حسنؒ کی کتاب المبسوط مراد ہوتی ہے۔

(۶) قالوا: (انہوں نے کہا) جس مسئلے میں فقہاء متفق نہیں ہیں اوران کے مابین اختلاف ہے وہاں لفظ قالوا لاتے ہیں۔ اس سے اس بات کو ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

(۷) عند فلان: (فلاں کے نزدیک) اس سے کسی فقیہ یا امام کا مسلک اور اس کی رائے بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

(۸) عن فلان: (فلاں سے) اس تعبیر سے کسی کی روایت اور قول کو نقل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی یہ بات فلاں عالم یا فقیہ سے پہنچی ہے۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ "عن فلان" کی اصطلاح ظاہر الروایۃ کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال ہوتی ہے اور "عند" کا لفظ فقہی مسلک پر دلالت کرتا ہے۔

(۹) بِمَا تَلَوْنَا: صاحب ہدایہ جب کسی مسئلے میں استدلال میں بیان کردہ آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یہ عنوان اختیار کرتے ہیں "بِمَا تَلَوْنَا" اس دلیل کے پیشِ نظر جس کو ہم نے تلاوت کیا۔

(۱۰) بِمَا رَوَيْنَا: اور اگر بیان کردہ حدیث کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو "بِمَا رَوَيْنَا" کہتے ہیں۔ یعنی اس بناء پر جو ہم نے روایت کیا۔

(۱۱) بِمَا ذَكَرْنَا: صاحب ہدایہ جب کسی عقلی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کے لئے "بِمَا ذَكَرْنَا" کا لفظ لاتے ہیں۔ یعنی جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔

(۱۲) خبر، اثر: لفظِ خبر سے حدیث مراد لیتے ہیں اور لفظِ اثر سے بسا اوقات صحابی کا قول مراد ہوتا ہے۔ اور بعض مرتبہ لفظِ خبر اور لفظِ اثر حدیثِ مرفوع کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

(۱۳) عندنا: (ہمارے نزدیک) اس سے مراد فقہائے احناف ہوتے ہیں۔

(۱۴) صاحبِ ہدایہ بعض مسائل کی وضاحت کے لئے سوالِ مقدر کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً: فإن قيل كذا، قلنا كذا یعنی اگر ایسا کہا جائے تو ہم اس کے جواب میں

یوں کہیں گے، یاإن قال قائل، فنقول یعنی اگر کوئی کہنے والا یہ کہے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے۔

(۱۵) جب صاحبِ ہدایہ ظاہر الروایۃ کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد امام محمد بن حسنؒ کی چھ (۶) کتب ہوتی ہیں: (۱) المبسوط (۲) الجامع الصغیر (۳) الجامع الکبیر (۴) الزیادات (۵) السیر الصغیر (۶) السیر الکبیر۔

(۱۶) شیخ مرغینانیؒ نے پوری کتاب (ہدایہ) میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ جو فقہی مذہب ان کے نزدیک سب سے قوی تر ہے اس کی دلیل دوسرے تمام فقہی مذاہب کی ادلہ کے بعد آخر میں بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ نقلِ مذاہب اور بیانِ اقوال میں قوی مذہب یا راجح قول کو پہلے بیان کر دیں لیکن جو فقہی مذہب اور رائے ان کے نزدیک سب سے قوی ہوگی اس کی دلیل آخر میں ذکر کریں گے اور یہ آخر میں دی جانے والی دلیل تمام سابقہ اقوال اور ان کے دلائل کا جواب ہوتی ہے۔ اور یہی آخری قول اور رائے ہی مصنفؒ کی نظر میں راجح اور قطعی ہے۔

وفي "نتائج الأفكار": من عادة المصنف المستمرة أن يؤخر القوي عند ذكر الأدلة على الأقوال المختلفة ليقع المؤخر بمنزلة الجواب عن المقدم، وإن كان قدم القوي في الأكثر عند نقل الأقوال.

(۱۷) صاحبِ ہدایہؒ بسا اوقات نص کی علت کو اصل مسئلے پر ایک مستقل عقلی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، تاکہ قاری کو دُہرا فائدہ حاصل ہو۔

(۱۸) آپ عقلی دلیل کو "فقہ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "والفقه فيه كذا"

(۱۹) آپ کبھی کبھار عقلی دلیل کے بعد ایک اور عقلی دلیل ذکر کرتے ہیں، گویا وہ "لمّی" دلیل کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ "نتائج الأفکار" میں کہا: "مصنف کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی دعوے پر دلیل بیان کرتے ہیں تو اس کے بعد کہتے ہیں: وھٰذا لأن...، اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اِنّی دلیل کے بعد لَمّی دلیل بیان کرے۔"

نوٹ: دلیلِ لِمّی اور اِنّی کو آسان طریقہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی حکم کو اس کی علّتِ واقعیہ سے ثابت کرنا دلیلِ لمی ہے اور کسی علامت سے ثابت کرنا دلیلِ انی ہے۔ (حاشیہ آسان منطق)

(۲۰) جب آپ یہ کہتے ہیں: "هذا الحديث محمول على المعنى الفلاني" تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ائمۂ حدیث نے اسے اس معنی پر محمول کیا ہے۔ اور جب وہ کہتے ہیں: "نحمله" تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ معنی ہماری طرف سے ہے، اہلِ حدیث نے اسے اس معنی پر محمول نہیں کیا۔

(۲۱) جب وہ کسی مسئلے میں کوئی نظیر (مشابہ مثال) بیان کرتے ہیں، اور پھر اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے تو وہ نظیر کے لیے بعید کے اسمِ اشارہ (جیسے ذٰلك) استعمال کرتے ہیں، اور اصل مسئلے کے لیے قریب کے اسمِ اشارہ (جیسے هذا) استعمال کرتے ہیں۔

(۲۲) جب آپ: "والتخريج كذا" کہتے ہیں تو اس سے مراد اپنی تخریج (استنباط) ہوتی ہے، اور اگر کسی دوسرے کی تخریج بیان کرنا چاہیں تو اسے اس کے صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(۲۳) ہدایہ میں دلیل کے سب مقدمات، بسا اوقات مذکور نہیں ہوتے۔ اسی طرح

دلیلِ سمعی کی وجہِ دلالت علی الحکم بھی بہت دفعہ ذکر نہیں ہوتی۔ گویا پوری دلیل نہیں، بلکہ دلیل کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اب ان اشارات کو کھولنا اور سب مقدمات ذکر کر کے پوری تقریر کرنا، یہ اہم کام ہے ہدایہ کے سبق میں ضروری ہوتا ہے۔ یعنی کبھی دلیل کے اجزاء: صغریٰ، کبریٰ، حدِّ اوسط میں سے کسی ایک کو ذکر کرتے ہیں اور باقی اجزاء کو فہم سامع پر یا بغرضِ اختصار چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے: وينعقد النكاح بلفظين يعبر بأحدهما عن الماضي وبالآخر عن المستقبل، مثل أن يقول: زوجني، فيقول: زوجتك؛ لأنَّ هذا توكيلٌ بالنكاح، والواحد يتولى طرفي النكاح. اس میں "هٰذا توكيل بالنكاح" صغریٰ ہے۔ "الواحد يتولى طرفي النكاح" کبریٰ ہے۔ یہاں نتیجہ کو ذکر نہیں کیا گیا۔ "النكاح" کا لفظ حدِّ اَوسط ہے جو دونوں جگہ اخیرین میں ہے۔ اسے گرانے سے یہ عبارت باقی رہ جائے گی: "فالواحد يتولى طرفي هذا"۔

ہدایہ ثالث کی پہلی دلیل ہے: "لأن البيع إنشاء ... والإنشاء يعرف بالشرع اس میں بھی نتیجہ مذکور نہیں ہے، نتیجہ ہوگا: "فالبيع يعرف بالشرع"۔

و إن ترك الذابح التسمية عمداً، فالذبيحة مينة لا تؤكل، و إن تركها ناسياً أكل . وقال الشافعي: أكل في الوجهين "وان التسمية لو كانت شرطاً للحل، لما سقطت بعذر النسيانة كالطهارة في باب الصلاة.

اس میں ایک قضیہ اور نتیجہ ذکر نہیں کیا گیا، وہ یہ ہے: "لكنّها لا تسقط بعذر النسيان، فلا تكون شرطاً للحل۔

کبھی تمثیل اور قیاس کے طور پر صرف مقیس علیہ کو کاف حرفِ تشبیہ کے ذریعہ ذکر کیا

جاتا ہے۔ جیسے: وأن المسكر يفسد العقل، ليكون حراما قليله وكثيره كالخمر. (كتاب الأشربة:۴/۴۹۷)

یہاں "مسکر" مقیس، "خمر" مقیس علیہ، علّتِ جامعہ فسادِ عقل اور حکم "حرام" ہے۔

(۲۴) ألا ترىٰ کہہ کر توضیح کرتے ہیں، اسے دلیلِ تنویری بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس مقام پر آتا ہے جہاں دلیل کا بہت ظاہر ہونا بتانا ہو۔ مثلاً باب الماء میں دباغت کے مسئلے میں فرمایا: ألا ترىٰ أنه ينتفع به حراسة واصطياداً. اس پر عینی کہتے ہیں: (ألا ترىٰ) كلمة ألا بفتح الهمزة وتخفيف اللام للتنبيه والتوضيح۔ باب الأمامة میں مسئلۂ محاذات میں فرمایا: ألا ترىٰ أنه يلزمه الترتيب في المقام. اس پر بابرتی کہتے ہیں: ألا ترىٰ توضيح لقوله لأن الاشتراك لا يثبت دونها۔

(۲۵) بعض مسائل اطراداً ذکر کر دیتے ہیں۔ مثلاً: فصل فی البئر میں بکری کے کنویں میں پیشاب کرنے کے مسئلے کے تحت تداوی بالمحرم کا ذکر استطراداً آیا ہے۔ اس طرح یہ غیر مظان میں مسئلہ ذکر کرنے کی ایک صورت بن جاتی ہے۔

(۲۶) دعوی کے جز پر دلیل لانے کے بعد کل پر دلیل لاتے ہیں۔ مثلاً باب الماء میں ومطلق الاسم يطلق على هذه المياه پر سعدی آفندی کہتے ہیں: الاستدلال على بعض المدعى ثم الكل طريقة يسلكها المصنف كثيرا.

(۲۷) اختصار کی وجہ سے مصادرِ منقول عنہا کا پورا حوالہ نہیں دیتے اور بسا اوقات قائل کا نام بھی اسی غرض سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس زمانے میں تدین و تبحرِ علمی کی وجہ سے ایسا کرنا بالکل کافی تھا۔ البتہ ہمارے دور میں ایسا کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

شروح وحواشی:

کسی کتاب کی اہمیت اور افادیت کو جانچنے اور پرکھنے کا اس سے بہتر اور غیر جانبدارانہ پیمانہ اور کیا ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ مصنفؒ کے ہم عصر اہلِ علم وفضل نے اس کتاب کو کس حد تک اہمیت دی ہے اسے کس قدر درخورِ اعتنا جانا ہے اور پھر بعد میں آنے والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیااور اعتنا کا سب سے بڑا مظہر اس کے بارے میں لکھی جانے والی کتب اور تحریریں ہیں۔ اہلِ علم جس کتاب کو جس درجہ اور رتبہ کی سمجھتے ہیں اسی حد تک اس پر کام کرتے ہیں اس کے حواشی، شروح تعلیقات اور اشاریوں وغیرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی سے کسی کتاب کے مقام ومرتبے کا تعین ہوجاتا ہے۔ یہ پیمانہ اگر عادلانہ ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس دعویٰ میں مبالغہ کی کوئی آمیزش نہیں کہ فقہ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ہمیں کوئی کتاب ایسی نظر نہیں آتی جس پر علماء نے اتنا کام ہو جتنا ہدایہ پر کیا ہے۔ کشف الظنون گیارہویں صدی ہجری میں لکھی گئی اس کے مصنف نے ہدایہ کے شروح وحواشی کی تعداد ساٹھ (۶۰) سے زیادہ لکھی ہے۔ اس کے کم وبیش ڈھائی سو برس میں ہدایہ پر جو کام ہوا ہے وہ بھی اس سے کم نہیں ہے جو کشف الظنون کے وقت تک ہوا۔ ہدایہ کی اہلِ علم نے متنوع اعتبارات سے خدمت کی ہے، کسی نے اس کی عبارت کی شرح کی توکسی نے اس کی احادیث کی تخریج کی کسی نے اس کا اختصار کیا، توکسی نے اس کے مسائل کی تجرید کی کسی نے اس پر تعلیقات لکھیں، توکسی نے ہدایہ میں موجود دلائل کی وضاحت کی، کسی نے اصول الہدایہ جمع کیے۔

مفتی محمد طارق محمود لکھتے ہیں: ہدایہ پر ہونے والے مختلف نوعیت کے علمی کاموں کی

کل تعداد ۱۲۰/ سے اوپر ہے۔ تاہم طبع شدہ شروح کی تعداد بہت کم ہے۔ دس سے کچھ زائد شروح مطبوع ہیں۔ ان اعمالِ علمیہ کی تفصیل مقدمہ سائد بکداش (ص۱۰۱ تا ۱۶۳) پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ان میں سے کم از کم فتح القدیر، عنایہ، بنایہ، کفایہ تخریجِ زیلعی، حاشیۂ سعدی لکھنوی اور سنبھلی کے مطالعے سے چارہ نہیں۔ مخرجینِ ہدایہ میں عبد القادر قرشی، علاء الدین ماردینی، جمال الدین زیلعی، بدرالدین عینی، ابنِ ہمام اور قاسم بن قطلوبغا شامل ہیں۔ ان شروحات میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) "نهاية": صاحبِ کشف الظنون کے مطابق ہدایہ کی سب سے پہلی شرح ان کے خاص شاگرد شیخ حسام الدین بن علی صنعاقی حنفی (م ۷۱۰ھ) نے لکھی، اس شرح کا نام انہوں نے "نهاية" رکھا۔

(۲) "معراج الدراية إلى شرح الهداية": شیخ قوام الدین محمد بن محمد البخاری الکاکی (م ۷۴۹ھ)، شیخ قوام الدین اس تالیف سے ۲۱/ محرم الحرام ۷۴۵ھ کو فارغ ہوئے، اس شرح کے بارے میں شارحِ علّام نے کہا کہ: اس وقت تک ہدایہ کی شرح و توضیح سے متعلق علماء جو کچھ لکھ چکے تھے یا درس و تقریر کے ذریعہ جو کچھ مجھ تک پہنچا تھا وہ میں نے سب کا سب اپنی شرح میں جمع کر دیا۔ جن مسائل میں ائمۂ اربعہ کا اختلاف تھا وہاں سب کی آراء جمع کر دیں۔ نیز اس میں یہ بھی وضاحت کر دی کہ قول کونسا صحیح ہے اور کون سا اصح ہے۔ قدیم فقہاء کے علاوہ جدید فقہا کے اقوال اور آراء کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور جہاں مناسب سمجھا انہیں بھی شامل کر دیا۔

(۳) "نهاية الكفاية في دراية الهداية": تاج الشریعہ عمر بن صدر الشریعہ الاوّل عبید اللہ المحبوبی الحنفیؒ (م ۶۷۲ھ)

(۴) ”العناية“: شیخ محمد بن محمود البابرتی الحنفی (م۷۸۶ھ) کی تالیف ہے اور محمد بن ابراہیم الدردری الحنفی المصری (م۱۰۶۶ھ) نے اس پر حاشیہ تحریر کیا ہے۔ ”العناية“ کو علماء نے ہدایہ کی ایک نفیس شرح تسلیم کیا ہے۔

(۵) ”البناية“: قاضی بدالدین محمود بن احمد معروف بالعینی (م۸۵۵ھ) اس کا شمار ہدایہ کی معروف اور مقبول شروح میں ہوتا ہے۔

(۶) ”فتح القدير للعاجز الفقير“: شیخ کمال الدین محمد عبدالواحد السیواسی الحنفی معروف بابنِ ہمام (م۸۶۱ھ)، ہدایہ کی تمام شروح میں سب سے زیادہ معروف اور مقبول شرح ہے تمام علماء نے اس کی تعریف کی ہے۔ شمش الدین احمد بن قورد المعروف بقاضی زادہ مفتی (م۹۸۸ھ) نے اس کا تکملہ لکھا ہے۔ جو ”تنائج الأفكار فی كشف الرموز و الأسرار“ کے نام سے موسوم ہے اور فتح القدیر کے ساتھ ہی شائع ہوا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فتح القدیر پر حاشیہ لکھا ہے، شیخ ابراہیم بن محمد الحلبیؒ (م۹۵۶ھ) نے فتح القدیر کی تلخیص کی ہے اور بعض مسائل میں ابنِ ہمام پر جرح وتنقید بھی کی ہے۔

(۷) کتاب ہدایہ پر ایک عمدہ ترین حاشیہ علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی بن عبدالحلیم لکھنویؒ (م۱۳۰۴ھ) کا ہے۔ حلِ ہدایہ کے لیے نہایت عمدہ ہے، مختصر اور مفید ہے۔ برِّ صغیر میں ہدایہ کے نسخوں کے ساتھ یہی حاشیہ طبع ہوتا چلا آیا ہے۔

تخاریجِ احادیثِ ہدایہ:

شروحِ ہدایہ کے ساتھ علماء نے ہدایہ کے حوالہ سے اور اہم خدمت انجام دی ہے، وہ یہ ہے کہ ہدایہ میں امام مرغینانیؒ نے احکام و مسائل یا دلائل کے ضمن میں جو احادیث ذکر کی ہیں

ان کی تخریج کی ہے اور اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ احادیثِ ہدایہ کی تخریج کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ صاحبِ ہدایہ نے اپنی کتاب میں اس امر کا اہتمام نہیں کیا تھا کہ احادیث کے حوالے دیں، حتیٰ کہ بعض مقامات پر انہوں نے حدیث کا مکمل متن بھی درج نہیں کیا۔ ایسا کرنے سے صاحب ہدایہ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا کہ وہ مسائل یا دلائل کے ضمن میں ہر قسم کی ضعیف و قوی احادیث کو جمع کردیں۔ اور نہ ہی انہوں نے کسی خاص وجہ کی بناء پر ان کے مآخذ و مصادر کی نشاندہی سے گریز کیا بلکہ صورت حال یہ ہے کہ ان کا موضوع فقہی مسائل اور اس کے ساتھ حنفی نقطۂ نظر کی وضاحت تھا۔ اور جس مسئلہ میں آراء مختلف تھیں وہاں امام ابوحنیفہؒ یا ان کے اصحابؒ کی رائے اور فتاویٰ کی وجوہ ترجیح بیان کرنا مقصود تھیں۔ نہ وہ حدیث کی کتاب لکھ رہے تھے اور نہ اسماء الرجال ان کا موضوع تھا جس میں حدیث کے اقسام، ان کے مراتب، سند اور مراجع سے بحث کرتے۔ لیکن ان کے بعض ناقدین نے ان کی کتاب کے اس پہلو کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے فقہاء احناف نے اس طرف بھی توجہ مبذول کی۔ اور ہدایہ میں جو احادیث مذکور تھیں ان کی تخریج کی۔ ان کی سند اور مراجع کی وضاحت کی اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں عام شروح کی طرح تخریجِ احادیث ہدایہ پر بھی متعدّد کتابیں لکھی گئیں۔ حسبِ ذیل کتابوں نے پوری اسلامی دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ منوایا۔ ان کتابوں کی تالیف کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ اہل علم ان کتابوں سے بے نیاز ہوگئے ہوں:

(۱) شیخ محی الدین عبدالقادر بن محمد القرشی المصری (م ۷۷۵ھ) نے ”الغایۃ فی معرفۃ احادیث الھدایۃ“ کے نام سے ایک جامع کتاب تالیف کی۔

(۲)شیخ علاؤالدین علی بن عثمان المعروف بابن الترکمانی الماردینی(م ۷۵۰ھ) نے "الکفایۃفی معرفۃ أحادیث الهدایۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

(۳)احادیثِ ہدایہ کی تخریج پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں سے زیادہ شہرت اور مقبولیت شیخ جمال الدین عبداللہ بن یوسف الزیلعیؒ (م۷۶۲ھ) کی تالیف "نصب الرایۃ لأحادیث الهدایۃ" کونصیب ہوئی۔ نویں صدی کے مشہور محدث امام احمد بن علی بن حجر العسقلانیؒ(م۸۵۲ھ)نے "الدرایۃ فی منتخب أحادیث الهدایۃ" کے نام سے نصب الرایۃ کی تلخیص کی۔

تخریجِ زیلعی احادیثِ احکام کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ سب مذاہب کے دلائل پورے انصاف اور اعتدال کے ساتھ یکجا کر دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات مخالفین کے دلائل پر کلام کی گنجائش ہونے کے باوجود بھی کلام نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیلعی حافظِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ مشائخِ صوفیہ میں سے بھی ہیں جن کے دل رذائل وشہوات سے پاک ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ذرا بھی تعصب نہیں۔ ابنِ ہمام اور ابنِ دقیق العید دونوں بھی ایسے ہی منصف اور معتدل مزاج جامع بین الحدیث والفقہ ہیں۔

"الدرایۃ فی منتخب أحادیث الهدایۃ" کے بارے میں حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: الحافظ ما أجاد في تلخيصه كما كان يرجى من براعته في التنقيح والتحرير و علو كعبه في التلخيص، وغادر كثيرا من النقول التي ما كان يحرى تركها. (تقدمۃ البنوری علی نصب الرایۃ)یعنی امام العصر حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: حافظ ابنِ حجر نے زیلعی کی تلخیص عمدہ نہیں کی، جیسے ان کے تنقیح وتحریر کے کمال اور تلخیص کے بلند

مرتبے سے امید تھی۔ بہت سی قیمتی نقول چھوڑ دیں جو چھوڑنی نہیں چاہیں تھیں!

وقال: وهذا بخلاف الحافظ ابن حجر فيتطلب دائما مواقع العلل ويتوخى مواضع الوهن من الحنفية ولا يأتي في أبحاثه ما يفيد الحنفية ويقول شيئا وهو يعلم خلاف ذلك، ولا يليق بجلالة قدره ذيل الصنيع وحاشا أن أغض من قدر الحافظ الذي يستحقه وانما هي حقائق ناصعة ووقائع ثابتة يجب على الباحث الناقد أن يعرفها. عفا الله عنه وبدل سيئاته حسنات (مصدر سابق:۸)

ترجمہ: ''اور فرماتے ہیں: یہ حافظ ابنِ حجر کے برخلاف ہے کہ وہ ہمیشہ (حنفیہ کے) عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور ان کمزوریوں کے درپے رہتے ہیں۔ اور اپنی ابحاث میں کوئی ایسی بات نہیں لاتے جس سے حنفیہ کو فائدہ پہنچے۔ اور جانتے بوجھتے اپنے علم کے خلاف بات کرتے ہیں۔ یہ رویہ ان کے بلند رتبے کے لائق نہیں۔ اور حاشا میں حافظ ابن حجر کے مرتبے میں کمی کروں جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ تو ثابت شدہ حقائق و واقعات ہیں۔ باحث ناقد پر انھیں جاننا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائیں اور ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دیں۔'' آمین

قال الشيخ البنوري: ومن دأبه في كتبه -ولا سيما فتح البارى- أنه يغادر حديثا في بابه يكون مؤيدا للحنفية مع علمه، ثم يذكره في غير مظانه لئلا ينتفع به الحنفية. (مصدر سابق:۷)

ترجمہ: ''شیخ بنوری فرماتے ہیں: حافظ ابنِ حجر کی اپنی کتابوں خصوصاً فتح الباری میں عادت ہے کہ وہ حنفیہ کی مؤید حدیث کو جانتے ہوئے بھی اس کے باب میں ذکر نہیں کرتے۔ پھر اسے غیر مظان میں ذکر کرتے ہیں، تاکہ اس سے حنفیہ کو فائدہ نہ پہنچے۔

ہدایہ میں حدیث کا حوالہ اور سند کیوں نہیں؟

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: صاحبِ ہدایہ حدیث کے حافظ تھے۔ اس لیے ان کو حدیث کے حوالہ کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس وقت پتہ کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا تھا کہ حدیث میں آیا ہے۔ مگر اس زمانہ میں چوں کہ تدین نہیں رہا، حوالہ میں صفحہ سطر سب کچھ لکھنا چاہیے تاکہ دوسرا دیکھ سکے۔ (ملفوظاتِ حکیم الاُمّت: ۱۴/ ۱۲۴، ۱۲۳) مولانا نعمانیؒ فرماتے ہیں: شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط، ملک العلماء کاسانی کی بدائع الصنائع اور شیخ الاسلام مرغینانی کی ہدایہ، کہ ان تینوں کتابوں میں جس قدر احادیث و آثار آئے ہیں وہ اصل میں متقدمین ائمۂ احناف ہی کی کتابوں سے منقول ہیں جن کو ان حضرات نے اپنے ائمہ کے اعتماد پر اختصار کے پیشِ نظر بلا ذکر حوالہ و سند درج کر دیا ہے۔

چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا "منية الألمعی" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

إن المتقدمين من علمائنا رحمهم الله كانوا يملون المسائل الفقهية وأدلتها من الأحاديث النبوية بأسانيدهم كأبي يوسف في كتاب الخراج والأمالي، ومحمد فى كتاب الأصل والسير، وكذا الطحاوى والخصاف والرازي والكرخي إلا في المختصرات، ثم جاء من اعتمد كتب المتقدمين وأوردوا الأحاديث في كتب من غير بيان سند ولا مخرج فعكف الناس على هذه الكتب.

ترجمہ: "ہمارے علمائے متقدمین اللہ ان پر رحم فرمائے مسائلِ فقہیہ اور ان کے دلائل کا احادیثِ نبویہ سے اپنی اسانید کے ساتھ املاء کراتے تھے۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج اور امالی میں اور امام محمدؒ نے کتاب الاصل اور کتاب السیر میں اور اسی طرح امام طحاویؒ،

خصافؒ، ابو بکر رازیؒ اور کرخیؒ نے اپنی اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ البتہ مختصرات کی املاء اس سے مستثنیٰ ہے۔ بعد میں وہ حضرات آئے جنھوں نے متقدمین کی کتابوں پر اعتماد کیا اور ان حدیثوں کو بغیر سند اور حوالہ کے اپنی تصانیف میں درج کیا، پھر لوگ انہی تصانیف پر متوجہ ہو گئے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے ائمہ کی کتابوں پر ویسا ہی اعتماد تھا جیسا امام بغویؒ اور شاہ ولی اللہؒ کو صحاحِ ستہ پر تھا۔ اور جس طرح امام بغویؒ نے مصابیح السنۃ میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ میں ان کتابوں کی روایات کو بلا حوالہ و سند درج کر دیا ہے، اسی طرح ان حضرات نے اپنے ائمہ کی روایات کو اپنی تصانیف میں جگہ دی ہے۔ بعد کو جب فتنۂ تاتار میں اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بلادِ عجم سے لے کر دار الخلافہ بغداد تک مسلمانوں سے جتنے علمی مراکز تھے ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہو گئے تو متقدمین کا علمی سرمایہ بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ اور بہت سی کتابیں جو پہلے متداوِل تھیں اس فتنہ میں بالکلیہ معدوم ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ متاخرین حفاظِ حدیث کو جنھوں نے ہدایہ وغیرہ کی احادیث کی تخریج کی ہے متعدّد روایات کے بارے میں تصریح کرنا پڑی کہ یہ روایت ان لفظوں میں ہم کو نہ مل سکی۔ کیوں کہ اربابِ تخریج نے ان روایات کو متقدمین ائمۂ حنفیہ کی تصانیف میں تلاش کرنے کے بجائے محدثین مابعد کی ان کتابوں میں تلاش کیا جو ان کے عہد میں متداوِل تھیں۔

اس سے بعض لوگوں کو صاحبِ ہدایہ کے متعلق قلّتِ نظر اور ان حدیثوں کے متعلق ضعف کا شبہ ہونے لگا۔ اور تعجب ہے کہ شیخ عبد الحق دہلوی بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ چنانچہ ہدایہ اور اس کے مصنف کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں: کتابِ

هدایه که در دیار مشهور و معتبرترین کتابها است نیز درین و هم انداخته چه مصنف وی در اکثر بنائی کاربردلیلِ معقول داده و اگر حدیثی آورده نزدِ محدثین خالی از ضعفی نه، غالباً اشتغالِ آں استاد در علمِ حدیث کمتر بوده است ولیکن شرحِ شیخ ابن الهمام جزاه الله خیر الجزاء تلافه آن نموده و تحقیق کار فرموده است. (شرح سفر السعادة:۲۳)

ترجمہ: ''کتاب ''الہدایہ'' جو بلادِ اسلام میں مشہور اور سب سے معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اس میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے کہ اس کے مصنف نے اکثر مقامات پر دلائلِ عقلیہ کو بنیاد بنایا ہے۔ اور اگر کوئی حدیث ذکر کی ہے تو وہ محدثین کے نزدیک ضعف سے خالی نہیں ہوتی۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤلف کا اشتغال علمِ حدیث میں کم رہا ہے۔ البتہ شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں –اللہ انہیں بہترین جزا دے– اس کمی کی تلافی کر دی ہے اور تحقیق فرمائی ہے۔''

حالاں کہ نہ تو صاحبِ ہدایہ کا شغل حدیث میں کم تھا، کیوں کہ وہ خود بہت بڑے ماہر محدث اور حافظ الحدیث تھے اور نہ جو حدیثیں وہ بیان کرتے ہیں وہ ضعیف ہیں کیوں کہ وہ سب اگلے ائمہ کی کتابوں سے منقول ہیں۔ خود ہم (مولانا محمد طارق محمود) نے متعدّد روایات کو دیکھا ہے کہ حافظ زیلعی اور حافظ ابنِ حجر عسقلانی وغیرہ مخرجینِ احادیثِ ہدایہ ان کے بارے میں بہ صراحت لکھتے ہیں کہ وہ ان کو نہ مل سکیں حالاں کہ وہ روایات کتاب الآثار اور مبسوط امام محمد وغیرہ میں موجود ہیں۔ اور یہ کچھ ہدایہ ہی کی خصوصیت نہیں، خود صحیح بخاری کی تعلیقات میں بھی بہت سے ایسی روایتیں موجود ہیں کہ جن کے بارے میں حافظ ابنِ حجر نے یہی تصریح

کی ہے۔ جس کی اصلی وجہ وہی ائمۂ متقدمین کی کتابوں کا فقدان ہے۔ ورنہ امام بخاری یا صاحبِ ہدایہ کی شان اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ ان کے متعلق کسی نے بے اصل روایت کے بیان کا کرنے کا شبہ بھی ظاہر کیا ہو۔

علامہ محمود بن سلیمان کفوی نے ''كتائب أعلام الأخيار من فقهاء مذهب النعمان المختار'' میں صاحبِ ہدایہ کے متعلق ان کے ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ: ''كان إماماً فقيهاً حافظاً مُحدِّثاً مُفسِّراً.'' اور حافظ قرشی نے ''الجواهر المضيئة'' میں لکھا ہے: ''رَحَلَ وسمِع ولَقِيَ المشائخَ و جمعَ لنفسِه مشيخةً كتبتُها وعلَّقتُ منها فوائد.'' یعنی ''انھوں طلب حدیث میں رحلت کی، حدیث کا سماع کیا، مشائخ سے ملے اور اپنا مشیخہ جمع کیا۔ جس کو میں نے بھی نقل کیا ہے اور اس سے فوائد کو اخذ کیا ہے۔'' مشیخہ وہ کتاب ہے جس میں مؤلف اپنے شیوخ کے حالات اور ان کی مرویات واجازات کو جمع کرتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایہ کی جو حدیث متداوِل کتبِ حدیث میں نہ ملے اسے حنفیہ متقدمین کی کتب میں تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ حال ہی میں مولانا یوسف شبیر احمد کی کتاب ''العناية في تحقيق الأحاديث الغريبة في الهداية'' شائع ہوئی ہے۔ ۲/ جلدوں میں ہے۔ اس میں مزید ۸۰/ غریب احادیث کی تخریج ہے۔ اور یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کسی فقہی مذہب کے پیرو کار کے لیے حدیث کے ثبوت کا مدار دراصل اس کے امام مجتہد کے قبول کرنے اور دلیل لینے پر ہے۔ (بحوالہ: امام مرغینانی کی کتاب ہدایہ کا تعارف)

محقق العصر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۴ھ) صاحبِ ہدایہ کی علمِ حدیث میں جلالتِ شان اور ہدایہ میں موجود روایات کے متعلق لکھتے ہیں:

قلتُ: ویدل علی کونه مُحدِّثاً حافظاً للحدیث کثرةُ ما أودعه في کتبه لاسیما الهدایة من الأحادیث، وقد اعتنی الحافظ الزیلعي بتخریجها في کتاب سماه ''نصب الرایة في تخریج أحادیث الهدایة'' ولخصها الحافظ ابن حجر العسقلاني فسماه ''الدرایة لأحادیث الهدایة'' وکل حدیثٍ قال فیه الحافظان غریب لم نجده قد وجدتُ الکثیر منه والله الحمد في کتاب الخراج للإمام أبي یوسف، وفي کتاب الآثار له وفي کتاب الآثار للإمام محمد بن الحسن، وفی کتاب الحجج له -رحمه الله علیهما-، ویدل علی براعته فی العربیة والأدب ما في کتاب الهدایة من الفصاحة والبلاغة والانسجام والسلاسة کما اعترف به بعض الأدباء من الشیعة حیث قال: أفصح الکتب في الإسلام بعد کتاب الله البخاري ثم الهدایة، ولعله لم یطلع علی الموطأ للإمام محمد رحمه الله ولا علی الجامع الصغیر له، وإلا لقال: أفصح الکتب بعد کتاب الله الموطأ لمحمد رحمه الله ثم البخاري ثم الجامع الصغیر لمحمد ثم الهدایة ..

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ صاحبِ ہدایہ کے محدث اور حافظ الحدیث ہونے پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کثرت کے ساتھ اپنی کتابوں میں احادیث نقل کی ہیں، خصوصًا ہدایہ میں۔ حافظ زیلعی نے ان احادیث کی تخریج اپنی کتاب ''نصب الرایة في تخریج أحادیث الهدایة'' **میں کی ہے۔ اس کتاب کی تلخیص حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے** ''الدرایة لأحادیث الهدایة'' **کے نام سے کی۔ ہر وہ حدیث جس کے بارے میں ان دونوں حفاظ حدیث نے فرمایا کہ یہ روایت غریب ہے ہمیں نہیں ملی، ان میں سے اکثر احادیث اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مجھے امام ابو یوسف کی** ''کتاب الخراج'' **اور** ''کتاب الآثار'' **اور امام محمد کی** ''کتاب الآثار'' **اور** ''کتاب الحجج'' **میں مل گئیں۔ صاحبِ ہدایہ کی عربیت اور**

ادبیت میں مہارت کا اندازہ ہدایہ کی فصیح و بلیغ مربوط اور سلاست بھری عبارت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض شیعہ ادباء نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام میں کتاب اللہ کے بعد سب سے فصیح کتاب بخاری اور پھر ہدایہ ہے۔ شاید یہ امام محمد کی ''المؤطا'' اور ''الجامع الصغیر'' پر مطلع نہیں ہوئے، ورنہ یہ کہتے کہ کتاب اللہ کے بعد سب سے فصیح کتاب امام محمد کی ''المؤطا'' پھر ''صحیح البخاری'' پھر ''الجامع الصغیر'' اور پھر ''الهداية'' ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ہدایہ میں عقلی دلیل بیان کرنے کا اہتمام سمعی دلیل سے نسبتاً زیادہ ہے۔ چنانچہ بسا اوقات دلیلِ سمعی کو بیان نہیں کرتے اور بعض دفعہ دلیلِ عقلی کو پہلے بیان کرتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ دلیلِ عقلی رُتبتاً دلیلِ سمعی سے مقدم ہوگئی معاذ اللہ۔ بلکہ یہ انداز بعض عوارض کی بنا پر ہے۔ مولانا محمد عبد الرشید نعمانی فرماتے ہیں: ''قد علم من عادته أی عادة صاحب الهداية أنه صنف كتابه هذا لايراد الدلائل العقلية دون النقلية، فلذا يكتفى بايرادها كثيرا و معه أحاديث مثبتة لمدعاه.'' (تعليق ذب ذباب الدراسات:۷۵/۱) ''صاحبِ ہدایہ کی عادت معلوم ہے کہ انھوں نے یہ کتاب دلائلِ عقلیہ کے لیے لکھی ہے، نہ کہ دلائلِ نقلیہ کے لیے، یہی وجہ ہے کہ وہ بسا اوقات صرف دلائلِ عقلیہ پر اکتفا کرتے ہیں حالاں کہ اس مسئلے میں احادیث بھی ہوتی ہیں۔'' دکتور سائد بکداش کہتے ہیں: ''ومن منهج المرغيناني في الاستدلال في الهداية أنه في مسائل كثيرة يترك الاستدلال للمسئلة بماورد في السنة المرفوعة وآثار الصحابة مع وجود ذلك، ويقتصر على الدليل العقلي فقط.'' (مقدمة تحقيق الهداية:۸۳/۱)

”مرغینانی کا ہدایہ میں ایک منہج استدلال یہ بھی ہے کہ وہ بہت سے مسائل میں سنّتِ مرفوعہ اور آثارِ صحابہ کے ہوتے ہوئے بھی انھیں دلیل کے طور پر ذکر نہیں کرتے، بلکہ صرف دلیلِ عقلی پر کفایت کرتے ہیں۔“

”باب الصلاة فی الکعبة“ کے آخری مسئلے میں دلیلِ عقلی پہلے ذکر ہے اور دلیلِ سمعی بعد میں۔ اس پر محشی مفتی ابولبابہ کہتے ہیں:

”دلیل نقلی أخّره لیکون اختتام الکتاب والباب بالصلاة علی النبي ﷺ ولأن الدلیل العقلی مبنی علی القاعدة الکلیة المستنبطة من النصوص الکثیرة وهي عدم جو از ما فیه ترک تعظیم شعائر الله فان تعظیم شعائر الله من تقوی القلوب والحدیث مشتمل علی مسئلة جزئیة فتقدیم ما هو مستنبط من النصوص الکثیرة علی نص واحد من الحسن بمکان فاحکم هذا فان من لم یفهم هذه النکتة ربما یختلج في قلبه صنیع المصنف في مثل هذه المواضع.“

یعنی ”دلیلِ نقلی کو مؤخر کیا ہے تاکہ کتاب اور باب کا اختتام نبیِ اکرم ﷺ پر درود سے ہو۔ اور اس لیے بھی کہ دلیلِ عقلی کی بنیاد قاعدۂ کلیہ ہے جو بہت سی نصوص سے مستنبط ہے۔ اور وہ یہ کہ جس کام میں شعائر اللہ کی تعظیم ترک ہو وہ کام جائز نہیں، کیوں کہ شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقوی سے ہے۔ اور حدیث ایک مسئلۂ جزئیہ پر مشتمل ہے۔ تو نصوصِ کثیرہ سے مستنبط دلیل کو ایک نص پر مقدم کرنے کا حسن ظاہر ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔ کیوں کہ جو یہ نکتہ نہیں سمجھتا بسا اوقات اس کے دل میں اس طرح کے مواضع میں مصنف کا انداز باعث خلجان ہوتا ہے۔“

مفتی ابولبابہ شاہ منصور ''آپ ہدایہ کیسے پڑھیں''میں لکھتے ہیں: جاننا چاہیے کہ بظاہر تو یہ عقلی دلائل ہیں، لیکن در حقیقت یہ نقلی دلائل ہیں بلکہ نص جزئی نقلی سے زیادہ مضبوط نقلی دلیل ہے۔ اس لیے کہ ان میں جو کل یہ مضمر ہوتا ہے وہ متعدّد دائل نقلیہ سے مستنبط و مؤید ہوتا ہے۔ مثلاً کسی آیتِ کریمہ یا حدیث شریف میں کوئی جزئی حکم ہے لیکن بہت سی آیات اور احادیثِ مبارکہ سے کوئی کلی حکم ثابت ہو چکا ہے اور قواعدِ شرع عامہ میں سے ایک مستند اصول اور مسلّمہ قاعدہ بن چکا ہے، اب اس کو اگر کسی عقلی دلیل کا جز بنایا جائے گا تو بظاہر وہ عقلی دلیل ہوگی لیکن اس میں مذکور کلیہ چوں کہ دلائلِ نقلیہ متعدّدہ سے ثابت ہے اس لیے وہ در حقیقت نقلی دلیل ہی ہے۔ اب اس کو اگر کسی جزئی اعلیٰ دلیل مثلاً خبرِ واحد پر مقدم کیا جائے گا تو یہ نقلی دلیل کی حدیث شریف پر ترجیح نہ ہوگی، بلکہ احادیثِ کثیرہ شہیرہ کی حدیثِ واحد پر تقدیم و ترجیح ہوگی۔ اس موقع پر یہ کہنا کہ مجتہد امتی کی رائے کو معصوم نبی (ﷺ) کے قول پر ترجیح دی جارہی ہے، قطعاً بے جا اور بے محل ہوگا۔ حضراتِ حنفیہ کے صنع پر جو بعض اوقات اشکال ہوتا ہے کہ قیاس کو خبرِ واحد پر ترجیح دیتے ہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ وہ در حقیقت متعدّد نقلی دلائل سے ثابت مسلّمہ قاعدے کو ایک نقلی دلیل (خبرِ واحد) پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسا ہر گز نہیں کہ اُمّتی کی عقلی دلیل کو نبیِ پاک ﷺ سے منقول ''وحیِ غیر متلو'' پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں یہ نکتہ ہے کہ ایسا کرنا در حقیقت ''دلائلِ نقلیہ کثیرہ شہیرہ'' سے ثابت حکمِ کلی کی دلیلِ نقلی جزئی پر تقدیم ہے نہ کہ دلیلِ عقلی کی دلیلِ نقلی پر ترجیح۔ فافہم

قیاس کی دلیلِ نقلی پر ترجیح کیوں؟

اسی سے ملتی جلتی ایک اور بات بھی ملحوظ رہے کہ کبھی فقہاء فرماتے ہیں: یہ حکم خلافِ قیاس تھا مگر ہم نے فلاں آیت، حدیث یا اجماع کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا اور دلیلِ نقلی پر عمل کیا۔ اس سے بھی شبہ ہوتا ہے کہ کیا شارع علیہ السلام سے منقول دلائلِ نقلیہ پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضراتِ مجتہدین کے قیاس کے خلاف نہ ہوں (یا قیاس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے خلاف نہ ہو)؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ فقہائے کرام کے کلام میں ایسے موقع پر قیاس سے مراد وہ قاعدۂ شرعیہ ہوتا ہے جو نصوصِ کثیرہ سے مستنبط ہو اور فی الحقیقت وہ دلیلِ عقلی نہیں بلکہ متعدّد دلائلِ نقلیہ کا حاصلِ محصول ہے۔ قیاس کا معروف معنیٰ: "تعدية الحكم من الأصل إلى الفرع" ایسی جگہ مراد نہیں ہوتا۔ (كذا صرح به المحقق ابن الهمام في الفتح، انظر كتاب الصوم تحت قول المصنف:۲/۲٦٤) لہٰذا مذکورہ بالا جملۂ فقہیہ کا مقصد یہ ہوا کہ یہ حکم اگرچہ خلافِ قیاس یعنی شریعت کے عام مسلّمہ قواعد کے خلاف تھا لیکن ہم نے کسی نص خاص کی بنا پر عام قاعدے سے اس کو مستثنیٰ قرار دیا۔ گویا نصِ خاص کو نصوصِ عامہ پر ترجیح دی، نہ کہ رائے کو نصوص پر استثناء کا یہ عمل ہی "استحسان" کہلاتا ہے۔ اس نکتے کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

بعض ضروری اصطلاحات کی توضیح:

ان بعض اصطلاحات کا جان لینا بھی ضروری ہے جو ہدایہ کے حاشیہ میں یا بین السطور آتی ہیں۔ بالخصوص اس نسخہ میں جس پر مفتی ابولبابہ صاحب مدظلہ نے تحقیق کی ہے اور مکتبۃ البشریٰ سے شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہو چکا ہے۔ ان ضروری اصطلاحات کے نا جاننے کی وجہ سے بسا اوقات عبارت فہمی دشوار ہو جاتی ہے۔

(۱)ہدایہ میں بسا اوقات آتا ہے: ''سببیت پائی گئی یا محلیت موجود ہے یا اہلیت موجود ہے'' اس سلسلے میں علماء کہتے ہیں سببیت و اہلیت کے جمع ہونے سے انسان حکم کا مخاطب ہو جاتا ہے۔اسی طرح اہلیت وسببیت کے پائے جانے یعنی ''صدور من الأهل ووقوع على المحل'' سے بھی حکم ثابت ہوجاتا ہے۔یعنی جس چیز کا سبب متحقق ہواور عاقد میں اہلیت بھی ہو یا جو چیز اہل سے صادر ہواور محل پر واقع ہو تو اس پر حکم ضرور مرتب ہوتا ہے۔ جیسے: وقال الشافعي: تصرفات الفضولي كلها باطلة؛ لأن العقد وضع لحكمه، والفضولي لا يقدر على إثبات الحكم فالفضولي لا يقدر على ما وضع العقدله ولنا: أن ركن التصرف صدر من أهله مضافا إلى محله، ولاضرر فى انعقاده، فينعقد موقوفاً.

(۲)مقتضی ومانع: یہ ایک مرکب علّت ہے، جب کسی چیز کا مقتضی پایا جائے اور مانع موجود نہ ہو تو حکم ضرور ثابت ہوگا۔وجود مقتضی وانتفاء مانع، فقہائے کرام کے ہاں مستقل دلیل ہے۔ یعنی جس چیز کا مقتضی موجود اور مانع غیر موجود ہو وہ شرعًا ثابت مانی جاتی ہے۔

(۳)جلبِ نفع و دفعِ ضرر: جب کسی چیز میں جانبین کا فائدہ ہو اور کسی کا ضرر نہ ہو تو شرعًا وہ صحیح اور نافذ مانی جاتی ہے۔ یہ بھی مرکب علّت ہے۔ یہ ''وجود مقتضی انتفاء مانع'' میں داخل ہے۔

(۴)تحقیقِ مناط: تحقیق کا معنی ثابت کرنا اور مناط کا معنی علّت اور مدارِ حکم ہے، ''النظر في تحقق العلة الثابتة بالنص أو الإجماع في واقعة غير التي ورد فيها النص'' یعنی حکم کی علّت نص یا اجماع سے معلوم ہو پھر مجتہد غور کرکے اس نوع کے دیگر افراد میں یہ

حکم ثابت کرے۔ جیسے: ﴿أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ﴾[الأنعام:١٤٥] اس میں علّت "رِجْسٌ"منصوص ہے۔

(۵)تنقیحِ مناط: تنقیح کا معنی ہے تہذیب و تلخیص ہے۔"تهذيب العلة وتخليصها عما علق بها من الأوصاف التي لا مدخل لها في العلمية"یعنی نص میں موجود اوصافِ متعدّدہ میں سے وصفِ مؤثر کو اوصافِ زائدہ سے جدا کر کے علیّت کے لیے متعیّن کرنا۔ جیسے:"حديث الأعرابي الذي وقع أهله في نهار رمضان" امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وجوبِ کفارہ کی مناط و علّت "الافطار في نهار رمضان عمداً" ہے۔ باقی امور مثلاً اپنی بیوی سے جماع کرنا قُبل میں ایلاج کرنا وغیرہ زائد ہیں۔ ان کو علّت بننے میں دخل نہیں۔

(۶) تخریجِ مناط:"استنباط العلة غير المنصوص عليها أو غير المجمع عليها" یعنی شارع نے نص میں "أوصاف محتملة التاثير" کو بیان نہیں کیا۔ اب مجتہد خارج سے وصفِ مؤثر کا تعین کرتا ہے تاکہ مسائلِ غیر منصوصہ کے حکم کا استخراج کیا جا سکے۔ جیسے اشیائے ستہ والی حدیث کہ اس میں علّت منصوص ہے نہ اوصافِ مؤثرہ اس میں مذکور ہیں۔ تمام الفاظ اسمائے جامد کے قبیل سے ہیں۔ کوئی اسمِ مشتق ہے ہی نہیں کہ مادّۂ اشتقاق تک رسائی حاصل کر کے اسے علّت بنانے پر غور کیا جائے۔ مجتہدین نے خارج سے غور کر کے صالح للعلیت اوصاف کا استخراج کیا ہے کہ قدر مع الجنس ہے یا طعم و ثمنیت یا اقتیات و ادخار۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: آپ ہدایہ کیسے پڑھیں)

امام قدوری اور ان کی کتاب مختصر قدوری

نام ونسب:

ان کا پورا نام ابوالحسین احمد بن محمد بن احمد بن جعفر بن حمدان القدوری البغدادی ہے۔ آپ کی ولادت ۳۶۲ھ میں ہوئی۔

وفات:

آپ کا انتقال بغداد میں اتوار کے دن، ۵ / رجب (اور بعض کے نزدیک رجب کے وسط میں) ۴۲۸ھ میں ہوا، اُس وقت آپ کی عمر چھیاسٹھ (٦٦) سال تھی۔

دفن:

خطیب بغدادی اور سمعانی کے مطابق، آپ کو اُسی دن اپنے گھر میں ''دربِ أبی خلف''میں دفن کیا گیا۔ ابنِ خلکان وغیرہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ بعد میں آپ کا جنازہ وہاں سے اُٹھا کر شارع المنصور کی ایک تربت (قبرستان) میں منتقل کیا گیا، اور آپ کو امام ابوبکر الخوارزمی محمد بن موسیٰ (متوفی: ۴۰۳ھ) (جو امام ابوبکر الجصاص رازی کے شاگرد اور حنفی فقیہ تھے) کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

امامِ قدوری نے چھیاسٹھ برس ایسی زندگی گزاری جو علمِ نافع، عملِ صالح، اور عام وخاص کے لیے نفع وبرکت سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، تلاوت کثرت سے کیا کرتے، اللہ تعالیٰ نے بہترین دل ودماغ نصیب فرمایا تھا اسی لیے ان کی تقریر وتحریر میں نہایت حسن وجمال تھا۔

وجہِ لقب:

امامِ قدوری اس لقب سے کیوں مشہور ہوئے؟ اس بارے میں مختلف آراء ہیں:

بعض کے نزدیک "قدور" بغداد کے قریب ایک بستی یا محلہ کا نام ہے، بعض کے نزدیک یہ نسبت قدور (یعنی دیگوں) کی خرید و فروخت یا بنانے کے پیشے سے ہے یعنی یا تو خود امامِ قدوری اس پیشے سے وابستہ تھے، یا اُن کے کسی بزرگ نے یہ کام کیا تھا، اس لیے ان کی نسبت اسی طرف کر دی گئی۔

امامِ قدوری ایک علم، فضل، دیانت اور صلاح والے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ محمد بن احمد ایک عالم اور محدث تھے۔ امامِ قدوری نے اپنے والد کے زیرِ سایہ تربیت پائی، اور علم و مرتبہ میں ترقی کرتے کرتے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی، خصوصاً فقہ اور حدیث میں آپ کی علمی روشنی خوب چمکی۔

اولاد اور وجہِ تالیف:

اللہ تعالیٰ نے امام قدوری کو ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام محمد ابو بکر تھا۔ انہوں نے ابو علی الحسن بن احمد بن شاذان اور قاضی ابو القاسم التنوخی وغیرہ سے حدیث سنی۔ لیکن وہ ۴۴۰ھ میں کم عمری میں وفات پا گئے۔ امام قدوری نے اپنی کتاب "المختصر" اسی بیٹے کے لیے تصنیف فرمائی تھی۔

بغداد کا علمی ماحول:

امام قدوری کے زمانے میں، یعنی چوتھی صدی ہجری کے وسط سے پانچویں صدی کے ایک تہائی تک، بغداد میں علمی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ مدارس عام ہو چکے تھے، کتب خانے علمی ذخائر سے بھرے ہوئے تھے، درس و تدریس کے حلقے قائم تھے، مناظرے ہوا کرتے تھے اور ہر فن کے بڑے بڑے ائمہ موجود تھے۔ یقیناً ایسا علمی ماحول ہی امام

قدوری جیسے ایک بڑے امام و فقیہ کو جنم دیتا ہے۔

دکتور بکداش فرماتے ہیں: میں نے امام قدوری کی علمی نشو و نما کے بارے میں ایک مختصر خبر امام سخاوی (م ۹۰۲ھ) کے قول میں دیکھی ہے۔ وہ "العلم في الصغر كالنقش في الحجر" (بچپن میں حاصل کیا گیا علم پتھر پر نقش کی مانند ہوتا ہے) کے تحت لکھتے ہیں: یہ بات عام طور پر درست ہے، لیکن بعض افراد جیسے امام قفّال اور امام قدوری نے بڑکپن میں علم حاصل کرنا شروع کیا، پھر بھی اپنے علم میں بہت بلند مرتبہ حاصل کیا اور عظیم شان و وقار کے حامل ہوئے۔

اساتذہ:

امام قدوری کے سوانح نگاروں نے ان کے چند ہی مشہور اساتذہ کا ذکر کیا ہے، اگرچہ ان کی تعداد زیادہ تھی۔ ان نمایاں اساتذہ میں سے چند یہ ہیں:

۱. ابوالحسین عبیداللہ بن محمد بن احمد بن اَحوی بن العوام بن حوشب الشیبانی (متوفی: ۳۷۵ھ) جو الحوشی کے نام سے معروف ہیں۔ ان سے آپ نے علم حدیث حاصل کیا۔

۲. ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ بن مہدی الجرجانی الحنفی۔ امام ابو بکر الرازی الجصاص کے شاگردوں میں شامل تھے۔ امام قدوری نے انہی سے فقہ میں تفقہ حاصل کیا۔ ان کی وفات ۳۹۸ھ میں ہوئی، اور انہیں امام ابو حنیفہؒ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

۳. ابوبکر محمد بن علی بن سوید (متوفیٰ: ۳۸۱ھ) ان سے بھی آپ نے علمِ حدیث حاصل کیا۔

شاگرد:

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے علماء نے امام قدوری سے علم حاصل کیا، البتہ کتبِ

تراجم میں صرف چند مشہور شاگردوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ممتاز شاگرد یہ ہیں:

۱. خطیب بغدادی: ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بغدادی، شافعی، فقیہ، محدث، حافظِ حدیث اور مشہور مؤرخ تھے۔ انہوں نے امام قدوری سے علم حاصل کیا، اور بعد میں اپنے زمانے کے امام و محدثِ کبیر بنے۔

۲. ابو نصر احمد بن محمد بن محمد بغدادی، آپ ایک ماہر حنفی فقیہ اور امام تھے اور مختصر القدوری کے شارح ہیں۔

۳. عبدالرحمن بن محمد السرخسی، امام، فقیہ، قاضی، عبادت گزار اور زاہد تھے۔ ان کی مشہور تصنیف ''تكملة التجريد للقدوري'' ہے۔

۴. ابوالقاسم عبدالواحد بن علی بن برہان العکبری صاحب التصانیف ہیں، فقیہ حنفی، اور علمِ نحو ونسب کے جلیل القدر عالم تھے۔

۵. ابو عبداللہ محمد بن علی بن محمد بن الحسین بن عبدالملک الدامغانی الکبیر، یہ قاضی القضاۃ، امام فقیہ، اور حنفیہ کے بڑے ائمہ میں سے تھے۔ ان کے زمانے میں حنفی مذہب کی قیادت انہی پر ختم ہوئی۔ وہ بہت صاحبِ عقل، کامل فضیلت، درست رائے والے، عفیف اور پاکیزہ نفس انسان تھے۔ ان کی وجاہت، عزت اور فہم و دانش کے اعتبار سے ان کی مثال قاضی ابو یوسفؒ سے دی جاتی تھی۔

۶. ابوالحارث محمد بن ابی الفضل محمد السرخسی، یہ بڑے حنفی فقیہ اور امام تھے۔ ایک مرتبہ ان کا ذکر امام قدوری کے سامنے کیا گیا تو فرمایا: ''خراسان اور ماوراء النہر سے اس سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں آیا''۔

۷. المفضل بن مسعود بن محمد یحییٰ التنوخی۔

امام قدوری کا علمی مقام اور علما کی مدح سرائی:

جن علما نے امام قدوری کا تذکرہ کیا ہے، سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ احناف کے سربراہ اور اپنے زمانے میں ان کے پیشوا تھے۔ سب نے ان کی علمی فضیلت اور سچائی پر اتفاق کیا اور ان کی تعریف کی۔

خطیب بغدادی اپنے استاد امام قدوری کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حدیثیں بہت کم بیان فرماتے اور میں نے بھی ان سے حدیثیں لی ہیں۔ آپ انتہائی سچے تھے اور دیانت دار بھی، فقہ میں بہت ذہین و فطین تھے، اور عراق میں اصحابِ امام ابو حنیفہؒ کی قیادت انہی پر ختم ہوئی۔ ان کا مرتبہ ان کے درمیان بہت بلند تھا، اور وجاہت میں ممتاز تھے۔

امام امیر کاتب الإتقانی الأترازی (وفات ۷۵۱ھ)، جو "غاية البيان شرح الهداية" کے مصنف ہیں، فرماتے ہیں: "شیخ ابوالحسن القدوری رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں ایک عظیم و عمیق سمندر اور حدیث میں ایک برکت ورحمت برسانے والے بادل تھے۔ ان کے علم کی فراوانی پر سب سے بڑی دلیل ان کی "مختصر الکرخی" پر لکھی ہوئی شرح ہے۔ جب کوئی اس کو غور سے پڑھے، تو فوراً سمجھ جائے گا کہ ان کا علمی مقام آسمان کے ستارے "العیّوق" کی طرح ہے، جس تک ہر شخص کی رسائی نہیں۔ اور جو بھی فقیہانہ نظر سے اس کا مطالعہ کرے، اس کی نگاہ تھک کر پلٹ آتی ہے۔" (یعنی وہ ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا)

امام قرشی (وفات ۷۷۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب "الجواهر المضيئة" میں فرمایا: "كان القدوري حَسَن العبارة في النظر، جري اللسان، مديماً لتلاوة القرآن." یعنی "قدوری نظر و فکر میں نہایت خوب تعبیر کرنے والے، فصیح اللسان اور قرآن کی تلاوت کثرت سے کرنے والے تھے۔"

اور امام ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ) نے اپنی کتاب "البداية والنهاية" میں لکھا: "كان إماماً بارعاً عالماً، وثبتاً مناظراً." وہ ایک بے مثال امام، ماہر عالم، مضبوط مناظر تھے۔

امام ذہبی نے انہیں حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے، اور اپنی مشہور کتاب "تذكرة الحفاظ" میں ان کا تذکرہ و ترجمہ درج کیا ہے۔

امام قدوری کی تصنیفات:

اللہ تعالیٰ نے امام قدوری کی علمی کاوشوں اور خدمات میں بے پناہ برکت عطا فرمائی۔

آپ نے فقہائے اُمّت کے اختلافات اور ان کے دلائل پر کئی عظیم اور وقیع کتابیں تصنیف کیں، جو فقہ و حدیث اور دیگر علوم میں آپ کی امامت، گہرائی اور مہارت کی واضح دلیل ہیں۔

آپ کی سب سے مشہور تصنیف "المختصر" ہے، جو فقہِ حنفی کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اس میں فقہِ حنفی کے اہم ابواب اور مسائل کو مختصر انداز میں، بغیر دلائل کے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ جو شخص عملی احکام اور فیصلہ شدہ فقہی مسائل جاننا چاہے، بغیر اس کے کہ وہ دلائل اور مناقشات میں پڑے، تو اس کے لیے "المختصر القدوري" ہی کافی ہے، جو بارہ ہزار فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ اور جو شخص دلائل و استدلالات، اور ان مسائل کے تفصیلی فقہی و اصولی پہلو جاننا چاہے، تو اسے قدوری کی بڑی تصانیف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

آپ کی چند کتابوں کا ذکر:

۱. "التجريد في مسائل الخلاف بين الحنفية والشافعية" یہ کتاب ۱۲/ جلدوں میں محقق شکل میں مطبوع ہے۔

۲. "شرح مختصر الكرخي"

۳. ”التقريب فی المسائل الخلافية بين الإمام أبی حنيفة وأصحابه“

۴. ”التقريب فی المسائل الخلافية بين الإمام أبی حنيفة و أصحابه مع الأدلة“

۵. ”أدب القاضی علی مذهب الإمام أبی حنيفة“

۶. ”جزء فی الحديث“ اس میں امام قدوری کی وہ حدیثیں ہیں جو آپ اپنے استاذ ابو بکر محمد بن علی المؤدب سے روایت کرتے ہیں۔

مختصر القدوری کی مزیت و منزلت اور علما کی اس پر ثنا و توصیف:

امام قدوریؒ نے اپنا فقہی رسالہ ”المختصر“ اپنے بیٹے محمد کے لیے جمع کیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مختصر کو غیر معمولی قبولیت عطا فرمائی، اور اس کے ذریعے بے شمار لوگوں کو نفع پہنچایا گیا۔ یہ کتاب فقہا و علما کے درمیان بلند و ممتاز مقام کی حامل بن گئی۔ علما نے اس پر کامل اعتماد کیا، اسے معتبر اور مقدم فقہی متون میں شمار کیا، اور مختلف پہلوؤں سے اس کی عظیم تعریف و توصیف کی۔

امام احمد بن محمد بن المظفر بن المختار الرازی (المتوفی ۵۰۰ھ) نے اپنی شرح ”حل مشكلات القدوري“ کی تمہید میں فرمایا: مختصر القدوری ایسی کتاب ہے جس کی گونج آفاق میں پھیل گئی، جسے رفقا نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور جس کی ضرورت اہلِ شہر و دیہات دونوں کو اس طرح پیش آئی، جیسے لوگ سخت گرمی میں ٹھنڈے، صاف و شفاف پانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور اس کی تعلیم و تدریس میں نہ صرف منتہی اور مبتدی علما نے دلچسپی لی، بلکہ اس کی قراءت اور مطالعہ کو بھی پیشوا اور طالبین سب نے لازم پکڑا، کیوں کہ اس میں اختصار کی خوبی،

اظہار کی لطافت، معانی کی جودت اور بنیادی اصولوں کی مضبوطی، ضروری مسائل کی کثرت، درست اور متفقہ الفاظ، اور طلبہ و قارئین کے لیے برکت اور سعادت پائی جاتی ہے۔ لوگ اتنے عقل مند ہیں کہ وہ کسی چیز کی تعریف اس کے آثارِ احسان دیکھے بغیر نہیں کرتے۔

اور امام المرغینانی نے اپنی ''کتاب بدایة المبتدی'' کی تمہید میں فرمایا: ''میں نے امام قدوریؒ کی ''المختصر'' کو سب سے خوب صورت کتاب پایا، جو بہترین اختصار اور حیرت انگیز کیفیت کی حامل ہے۔''

دکتور بکداش لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس مختصر کو اتنی قبولیت عطا فرمائی کہ آنکھیں بھی حیران رہ جائیں، یہاں تک کہ امام السمرقندی (وفات ۵۳۷ھ) نے اپنی کتاب ''تحفة الفقهاء'' کی تمہید میں، تقریباً قدوری کی وفات کے سو سال بعد فرمایا: ''فقہاء کی خواہش اس کتاب کی طرف عام ہوگئی، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔''

مولانا محمد زبیر روحانی بازی مدظلہ فرماتے ہیں: اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ہزار سال سے اس کتاب کو پڑھا اور پڑھایا جارہا ہے، اور آج بھی تمام مدارس میں داخل نصاب ہے۔ (اختصار پسند مدارس نے کنز کو خارج کردیا، شرحِ وقایہ سے بھی سبک دوشی حاصل کرلی، لیکن قدوری کو تمام جگہ داخل نصاب رکھا گیا ہے۔) یہ اس کتاب کی عند اللہ مقبول ہونے کی بڑی علامت ہے۔ اسی لیے یہ علماء کی توجہ کا مرکز ہے۔

یہ اتنی مبارک کتاب ہے کہ بہت سے اولیاء اللہ کا بیان ہے: کبھی کسی پر کوئی مصیبت یا تکلیف آن پڑے تو وہ اس کتاب کے پڑھنے سے دور ہوجاتی ہے، ہم نے کئی مواقع پر ایسا کیا اور مصیبت جاتی رہی۔ علماء نے لکھا ہے کہ جب امام قدوری نے اس کتاب کو مکمل فرمایا تو اس

کو اپنے ساتھ سفرِ حج پر لے گئے اور بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد اللہ تعالی سے دعا مانگی کہ اے اللہ! یہ کتاب میں نے آپ کو راضی کرنے کے لیے لکھی ہے اگر کوئی غلطی یا کوتاہی ہوئی ہو تو اس پر مطلع فرما۔ آپ نے کھول کر دیکھا تو پانچ چھ جگہ سے کچھ مسائل مٹ چکے تھے اور یہ ان کی بڑی کرامت ہے۔

صاحب ''اللباب فی شرح الکتاب'' فرماتے ہیں: ''إن الكتاب المبارك للإمام القدوري، قد شاعت بركته حتى صارت كالعلم الضروري، ولذا عكفت الطلبة على تفهمه وتفهيمه، وازدحموا على تعلّمه وتعليمه، وكنت ممن عكف عليه الأيام الكثيرة.''

فقہائے اُمّت میں کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جبال العلم علماء نے اس کی تقریباً ۶۰/ سے زائد شروح لکھی ہیں اور جگہ جگہ اپنی تصانیف میں اس کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ قدوری نے اس کو اختیار کیا، قدوری نے ایسا ہی ذکر کیا، قدوری میں یوں لکھا، اس سلسلے میں علامہ شامیؒ، علامہ حصکفیؒ، علامہ ابن نجیم مصریؒ، علامہ کاسانیؒ، علامہ ابن الھمامؒ، صاحبِ ہدایہؒ، علامہ شرنبلانیؒ، شیخ زادہؒ اور تاج الشریعۃؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

صاحبِ تحفۃ الفقہاء لکھتے ہیں: ''اعلم أن المختصر المنسوب إلى الشيخ أبي الحسين القدورى جامع جملا من الفقه مستعملة بحيث لاتراها مدى الدهر مهملة يهدى بها الرائض فى أكثر الحوادث النوازل ويرتقى بها المرتاض إلى المَراقى والمَنازل.''

اور علّامہ عبدالرزاق اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فإن المُختصر القدوری کتاب نفیس، بل هو من أحسن المتون وأنفعها فی فروع الحنفیة لذا تصدی له کبارُ العلماء.

قدوری متونِ معتبرہ میں سے ہے، متاخرین کی اصطلاح میں جب لفظِ متون بولا جاتا ہے تو اس سے صرف متون کی معتبر کتابیں مراد ہوتی ہیں، مثلاً: وقایہ، مختار، کنز اور قدوری، اور جب فقہ میں متونِ ثلاثہ بولا جاتا ہے تو اس سے تین متن: مختصر القدوری، وقایہ اور کنز مراد ہوتے ہیں، یہ سب متون زیادہ تر مذہب کی روایاتِ ظاہرہ اور مشہور اقوال پر مشتمل ہیں اس لئے معتبر ہیں، جیساکہ شامیؒ نے لکھا ہے: ''ثم لا یخفی أن المراد بالمتون المعتبرة کالبدایة ومختصر القدوری فإنها الموضوعة لنقل المذهب مما هو ظاهر الروایة.''

اندازِ بیان:

صاحبِ کتاب نے اپنی کتاب کو سہل انداز و عمدہ اسلوب سے طلبہ کے سامنے پیش کیا ہے۔ دکتور بکداش لکھتے ہیں: جہاں تک امام قدوریؒ کے اپنے مختصر میں طرزِ عمل اور منہج کا تعلق ہے، تو انہوں نے اس کتاب میں وہ تمام فقہی مسائل جمع کیے جو عام طور پر درپیش ہوتے ہیں، اور ان میں معتمد و مفتی بہ قول کو ذکر کیا۔ اس طرح یہ مختصر نہ تو طویل وملال انگیز اضافات سے بھرا ہوا ہے، نہ ہی بے حد اختصار کی وجہ سے خلل پیدا کرتا ہے۔ یہ کتاب فقہ کے تمام ابواب پر مشتمل ہے، اور امام قدوریؒ نے اسے فرائض اور احکامِ میراث کے ذکر پر ختم کیا۔ انہوں نے اختلافِ ائمہ جو ائمۂ حنفیہ ثلاثہ کے درمیان ہے اسے ذکر کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ امام زفرؒ کا قول بھی ذکر کرتے ہیں، مگر دیگر فقہی مذاہب کے اقوال کا تذکرہ شاذو نادر ہی کرتے ہیں۔

یہ مختصر دلائل سے خالی ہے، سوائے اس کے کہ ابتداء میں برکت کے طور پر وضو کی آیت ذکر کی، اور پھر ایک ہی حدیث لائے "حضرت مغیرہ بن شعبہؓ" کی وہ روایت جس میں نبی ﷺ کے وضو کا ذکر ہے اور کبھی کبھی اپنے فقہی عبارات میں دلائل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ امام قدوریؒ کی توجہ اس مختصر میں فقہِ حنفی کے خلاصۂ احکام اور نچوڑ کو ذکر کرنے پر مرکوز رہی۔ انہوں نے ان مسائل کو بیان کیا جن کی روزمرہ زندگی میں ضرورت پیش آتی ہے، مگر ان کے دلائل ذکر نہیں کیے۔ یہ بات واضح ہے کہ ان احکام کا خلاصہ اس قدر جامع اختصار کے ساتھ ذکر کرنا آسان کام نہیں، بلکہ تفصیل کے ساتھ لکھنا کہیں زیادہ سہل ہے۔

البتہ ان احکام کے دلائل اور ان سے استنباط کے طریقوں کا علم حاصل کرنا بھی نہایت مفید اور اہم ہے۔ اس کے بڑے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ مقلد مسلمان کے دل میں اپنے امام کے اجتہاد پر اطمینان و سکون پیدا ہوتا ہے، اور اسے علم ہوتا ہے کہ جن احکام پر وہ عمل کر رہا ہے، ان کے شرعی دلائل کیا ہیں اور ان سے استنباط کیسے کیا گیا ہے۔

اور جو شخص دلائل کی تفصیل، ان کے طرقِ استدلال، اور مخالف اقوال کے ردّ و مناقشہ کا مطالعہ چاہے، اس کے لیے امام قدوریؒ نے بارہ جلدوں میں "کتاب التجرید" تصنیف فرمائی۔ اسی طرح انہوں نے شرح "مختصر الكرخي" پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی، جو جدید طباعت میں تقریباً بیس جلدوں کے برابر بنتی ہے۔ اس میں انہوں نے دلائل کو نہایت تفصیل سے بیان کیا، بحث و مناقشہ اور تنقید و تجزیہ کے ساتھ۔

مختصر القدوری کی شروحات:

دکتور بکداش لکھتے ہیں: یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختصر القدوری کو علما اور طلبہ

کے درمیان غیر معمولی قبولیت عطا فرمائی۔ یہ کتاب حیرت انگیز طور پر وسیع پیمانے پر پھیلی، اور اللہ نے اس میں عظیم برکت رکھی۔ انہی برکتوں کی تکمیل یہ بھی تھی کہ علما نے اس کتاب کی علمی خدمت میں غیر معمولی دلچسپی لی، اور مختلف جہتوں سے اس پر کام کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے تدریس میں پڑھاتے تھے، اور طلبہ کو اس کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اس پر بے شمار شرحیں لکھی گئیں۔ حتیٰ کہ علامہ الشہاب المرجانی نے فرمایا: اس کی شرح ایسے بے شمار لوگوں نے کی ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ (ناظورۃ الحق: ۵۲)

اس کے بعد دکتور سائد بن محمد یحییٰ بکداش نے ۱۲۲/ شرحوں کا تذکرہ کرکے ان کا تعارف بھی پیش کیا، ہم سردست کچھ اہم شرحوں کو ذکر کرتے ہیں:

۱. "زاد الفقهاء": اس کے مصنف محمد بن احمد ابوالمعالی ہیں۔
۲. "المجتبیٰ": یہ شرح احمد بن مظفر شمس الائمہ کردری نے لکھی ہے۔
۳. "البيان في شرح المختصر": اس کے مصنف کا نام محمد بن رسول ہے۔
۴. "اللباب في شرح الكتاب": شیخ عبدالغنی الغنیمی المیدانی نے اسے تصنیف کیا ہے، یہ ایک عمدہ شرح ہے۔
۵. "الجوهرة النيرة": یہ شرح امام ابوبکر بن علی الحدادی کی تصنیف ہے۔
۶. "التسهيل الضروري لمسائل القدوري" مؤلفہ علامہ عاشق الٰہی البرنی۔
۷. "شرح مختصر القدوري للأقطع" یہ سب سے پہلی شرح ہے، یہ شرح امام احمد بن محمد، معروف بہ ابو نصر الاقطع کی تصنیف ہے، یہ امام قدوریؒ کے شاگرد تھے۔

نور الایضاح اور صاحبِ نور ایضاح:

نام ونسب:

علامہ، مدَقِّق، ابوالاخلاص حسن بن عمّار بن علی بن یوسف مصری، صوفی، شرنبلالی، حنفی۔

''شرنبلالی'' یہ ''شبرابلولۃ'' کی طرف منسوب ہے جو مصر کے دیہات میں ایک بستی کانام ہے۔ یہ نسبت خلافِ قیاس ہے،قیاس کے لحاظ سے ''شرابلولی'' ہونا چاہیے تھا۔

پیدائش:

۹۹۴ھ بہ مطابق ۱۵۸۵ء کوآپ کی پیدائش مقام ''شبرابلولۃ'' میں ہوئی۔

تحصیلِ علم:

لڑکپن ہی میں والدِ بزرگوار آپ کو بغرضِ تعلیم قاہرہ لے آئے تھے، اس وقت آپ کی عمر ۶/ سال سے زیادہ نہیں تھی، چنانچہ آپ نے اوّلاً قرآنِ کریم حفظ کیا، پھر دوسرے علوم حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے اور جو صاحبِ علم وکمال وہاں تھے ان سے استفادہ کیا۔ بالخصوص علمِ فقہ میں امام عبداللہ تحریری، علّامہ محمد المحبی اور شیخ علی المقدس سے استفادہ کیا۔

کنیت ''ابوالخلاص'' اور ''ابوالبرکات'' ہے، بقول علامہ شرنبلالی ان کی کنیت ''ابو الخلاص''ان کے شیخِ طریقت حضرت عبدالفتاح ابوالاکرام بن وفا نے رکھی تھی۔

اساتذہ:

(۱) احمد بن محمد علامہ احمد بن یونس سعودی مصری حنفی (۱۰۲۰ھ کے قریب وفات ہوئی) جو ابنِ شبلی سے مشہور ہیں۔

(۲)عبدالرحمن سیری جو ذیب یا ابن ذیب سے مشہور ہیں، ''خلاصۃ الاثر'' کے مصنف آپ بچپن میں ان سے پڑھا۔

(۳)عبداللہ بن محمد بن عبدالقادر التحریری جو شمس الدین کے نام سے مشہور ہیں۔

(۴)علی بن ابراہیم بن احمد جلی شافعی قاہری (ولادت ۹۷۵ھ وفات ۱۰۴۴ء) نورالدین شافعی سے مشہور ہیں سیرت حلبیہ کے مصنف یہی ہیں۔

(۵) محمد بن عبدالرحمن حموی مصری لقب شمس الدین حنفی (متوفی ۱۰۰۴ھ)، آپ فقہ، تفسیر، حدیث، قرأت، اصول، نحو کے امام تھے، آپ کی کئی تصانیف ہیں۔

(۶) شیخ الاسلام شمس الدین محمد المحبی (متوفی ۱۰۴۱ھ)، کبار علمائے احناف میں آپ کا شمار ہوتا ہے، لغت اور حدیث میں یکتائے روزگار تھے۔

تلامذہ:

(۱)احمد بن احمد بن محمد بن ابراھیم العجمی شافعی وفائی (ولادت: ۱۰۱۴ھ-وفات ۱۰۸۶ھ)

(۲)شہاب الدین احمد بن محمد الحسینی حموی ثم مصری (متوفی ۱۰۹۸ھ)

(۳)اسماعیل بن عبدالغنی اسماعیل نابلسی (ولادت ۱۰۱۷ھ-وفات ۱۰۶۲ھ)

(۴)حسن بن حسن بن عمار شرنبلالی (متوفی ۱۱۳۹ھ)

(۵)حسن بن علی بن محمد (متوفی ۱۰۹۷ھ)

(۶)شاھین بن منصور (ولادت ۱۰۰۳ھ-وفات ۱۱۰۱ھ)

ان کے علاوہ اور بھی کئی آپ کے جلیل القدر تلامذہ کی فہرست ہے۔

فائدہ: اساتذہ اور تلامذہ کے ذریعہ بھی شخصیت کی عظمت وقدرو منزلت کا اندازہ ہوتا

ہے کہ کس سرچشمۂ علم سے انھوں نے لیا ہے اور کیسے کیسے منابعِ علم ان سے سیراب ہوئے، اس لیے حالات وسوانح میں اس کو اہمیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

تدریس:

قاھرہ میں آپ نے تحصیلِ علوم میں خوب جانفشانی کی اور اپنے اساتذہ کے علم وفضل سے ہر طرح مستفید ہوکر ان کے سچے جانشین ہوئے، چنانچہ آپ کا شمار اپنے زمانہ کے ممتاز فضلا وفقہا میں ہونے لگا اور آپ کے علم کا شہرہ عام ہونے لگا، بالخصوص فتاویٰ میں آپ مرجع الخلائق تھے۔ كان أحسنَ المُتأخرين ملكةً فى الفقه وأعرفَهم بنصوصه وقواعده وكان العول عليه فى الفتوىٰ وتعيّن مدرِّساً فى القاهرة واشتغل عليه خلقٌ كثيرٌ. (امداد الفتاح:۱۳۰)

آپ ایک عرصہ تک جامعہ ازہر میں درس دے کر علم کی شمع جلاتے رہے اور تشنگانِ علم آآکر علم کی پیاس بجھاتے رہے۔

حضرت مصنفؒ کے بارے میں علماء کے اقوال اور ان کا فقہی مقام:

علامہ ''شرنبلالی''علم وفضل کے اس بلند مقام پر پہنچے کہ اس زمانہ کے بہت سے مشائخ اور اکابر فقہاء نے ان کی علمی عظمت وبرتری کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شیخ محبیؒ نے اپنے مصر کے ایک سفر میں فرمایا کہ: ''شیخ حسن شرنبلالی روشن سا چراغ اور چمکتے ستارے ہیں، اگر صاحب السراج الوھاب ان کو پاتے ان کے نورِ علم سے اپنے دل کو ضرور روشن کرتے یا صاحبِ ظہیرہ موجود ہوتے تو آپ کے ستارے علم کی روشنی میں گم ہوجاتے۔ یا ابن الحسن ہوتے تو حسنِ ثنا کے آپ پر پھول بکھیرتے''۔

فضل اللہ حمویؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں: كان نُقال المسائل الدينية ومُوضِح المُعضلات، صاحبُ خلُقٍ حسَنٍ وفصاحة وأحسنُ فقهاء زمانه وصنَّف كتُباً كثيرةً فى المذهب وأجلُّها حاشيةٌ علىٰ كتاب ''الدرروالغرر'' لمُنلا خسرو، واشتهرت فى حياته وانتفع الناس بها وهي أكبر دليل على ملكتة وتبحُّره.

یعنی وہ دینی مسائل کے بیان کرنے والے اور مشکل و پیچیدہ امور کو واضح کرنے والے تھے، خوش اخلاق، فصیح اللسان اور اپنے زمانے کے بہترین فقہاء میں سے تھے۔ انہوں نے فقہِ حنفی میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سب سے بلند پایہ تصنیف کتاب ملا خسروؒ کی ''الدرر والغرر'' پر آپ کا حاشیہ ہے، جو ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو گئی تھی، اور لوگوں نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ یہ ان کی علمی مہارت اور گہرے تبحّر کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

علامہ شامیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب رد المختار میں آپ کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے: ''فقيه النفس، ذى التاليف الشهيرة'' ایک دوسری کتاب میں فرمایا: ''عمدة المُحققين، فقيه النفس''۔

بیعت:

شرنبلالیؒ سلسلۂ شاذلیہ وفائیہ میں شیخ عبد الفتاح ابو الاکرام بن وفا سے بیعت تھے، اسی وجہ سے آپ کی نسبت وفائی بھی ذکر کی جاتی ہے۔ سلسلۂ وفائیہ، شاذلیہ کی ایک شاخ ہے جو شیخ وفا بن محمد النجم ابو الفتح اسکندری شاذلی مالکی (ولادت ۷۰۲ھ-وفات ۷۶۵ھ) کی طرف منسوب ہے۔

اسفار:

(۱) سب سے پہلا سفر چھ سال کی عمر میں شبرابلولۃ سے قاہرہ کی طرف اپنے والد کے ہمراہ کیا ہے۔

(۲) استاذ ابی الاسعاف یوسف بن عبدالرزاق وفائی کے ساتھ ۱۰۳۵ھ میں بیت المقدس ارضِ شام کا سفر کیا۔

(۳) کئی مرتبہ حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

وفات:

بہت سی علمی یادگار اور طلباء کے جمِ غفیر کو چھوڑ کر ۷۵ر سال کی عمر پاکر، گیارہ رمضان مبارک ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۵۹ء علم و ہنر کا یہ سورج، جمعہ کے روز عصر کے بعد غروب ہوگیا، اور لوگوں کے درمیان اپنی ذہانت اور علم وفقہ کے لازوال نقوش چھوڑ گیا۔ ع ہر کمالے رازوال است۔ تدفین کے حوالے سے اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مشہور و معروف قبرستان ”تُربۃُ المُجاوِرِین“ میں دفن کیا گیا۔

تصنیفیں:

شرنبلالیؒ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہیں، صاحبِ سبیل الفلاح فرماتے ہیں: ”اہم ترین تصانیف یہ ہیں:

(۱) ملا خسروؒ کی کتاب ”الدُّرَر والغُرَر“ پر آپ کا قیمتی حاشیہ ”غنية ذَوِی الأحكام فی بُغية دُرَر الأحكام“

(۲) نور الإيضاح ونجاة الأرواح

(۳)تحفة الأكمل

(۴)التحقيقات القدسية

(۵)إمدادالفتاح شرح نور الإيضاح

اور کئی رسائل بھی ہیں جو رسائلِ شرنبلالیؒ سے مشہور ہیں، ان کی تعداد ۴۸/ ہے۔ شیخ طلحہ منیار حفظہ اللہ نے مواہب الفتاح مقدمۃ نورالایضاح میں ۶/ رسائل بہت شرح وبسط کے ساتھ متعارف کرائے ہیں، مصنفؒ کی اہم کتابوں کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔(مواھب الفتاح:۶۱تا۶۹) مصنفؒ نے مختلف فقہی موضوعات پر اشعار میں بھی ۷/ کتابیں تحریر کی ہیں۔

کتاب کا تعارف:

مکمل نام: ”نور الإيضاح ونجاة الأرواح“

وجہِ تسمیہ:

امدادالفتاح میں مصنفؒ نے اس کی وجہِ تسمیہ یوں لکھی ہے:

سمّيتُه نورَ الايضاح إذ العلم نور ونجاة الأرواح إذ لا نجاة إلّا بالعلم، قال ابوالدرداء رضی اللہ عنہ: كن عالماً أو متعلِّماً أو مستمِعاً ولا تكن الرابع فتهلك. [أخرجه الدارمي فى باب العلم:۹۱/۱](إمدادالفتاح:۵۲)

یعنی علمِ دین جو کہ سراپا نور ہے، اس کو واضح کرنا ہے اور وہ روحوں کے نجاتِ کاملہ کا ذریعہ اور سامان بن سکے۔ علم کے بغیر عمل کی جستجو ضلالت وگمراہی ہے، علم کے ذریعہ سے راہِ عمل جو کہ سرمایۂ نجات ہے واضح اور روشن ہوجاتی سالک وہ راہ لے کر جنّت -جو کہ حق تعالیٰ کی جائے خوشنودی ہے- تک پہنچ جاتا ہے۔

مقبولیت واہمیت:

فقہِ حنفی میں ”نور الایضاح“ بہت مشہور اور مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ برسہا برس سے آج تک اکثر مدارسِ عربیہ میں داخلِ نصاب ہے۔ عمدہ ترین، جامع، نافع، مختصر متنِ متین ہے اور سہل الحصول اتنی کہ طبعِ انسانی میں سہل پسندی آنے کے باوجود یہ نہیں سنا گیا کہ کسی مدرسہ سے مشکل ہونے کی وجہ سے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہو۔ علوم وفنون کی تاریخ میں یہ بات کم ہی دیکھنے میں آئی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوتا رہے، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی کتاب کی بھی ایک مدّت ہوتی ہے، ایک خاص مدّت گزرنے کے بعد کتاب کی اہمیت وافادیت کم ہوجاتی ہے لیکن نور الایضاح کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک زمانہ کے گذر جانے کے باوجود اس کی اہمیت وافادیت میں کچھ کمی نہیں آئی۔

علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں: طالعتُ من تصانیفه "نور الإیضاح"، متنٌ متینٌ فی الفقه.

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: کتاب فی الأرکان الأربعة سهل الحصول.

اس کتاب کی اہمیت پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ علامہ شامیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”ردالمختار“ (جو شامی سے مشہور ہے) میں اس کتاب پر بھی اعتماد کیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف اپنی شرح ”مراقی الفلاح“ میں رقم طراز ہیں:

”اس کتاب کی جسامت وضخامت کم ہے لیکن علمِ کثیر سے لبالب ہے، اس کتاب میں

لگائے گئے تمام تر احکام صحیح ہیں: اسلام کے ارکانِ خمسہ کی صحت جن مسائل کے جاننے پر موقوف ان کو یہ کتاب جامع ہے، توضیح وتشریح ایسی عبارت سے کی گئی ہے جو ماہِ بدر اور آفتاب کی طرح روشن ہے، کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہ اور اجماع کے دلائل سے مزین ہے، مسلمانوں کے دل اس سے خوش اور گوش وبصر یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔"

(مواہب الفتاح:۷۷)

وجہِ تالیف:

کتاب لکھنے کی وجہ خود مصنفؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ذکر کی ہے کہ: "بعض دوستوں نے -خدا ہماری اور ان کی بابت اپنی پوشیدہ مہربانی کو کام میں لائے- فرمائش کی کہ میں ایک مقدمہ (چھوٹا رسالہ) عبادات کے متعلق تحریر کردوں جو ان مسائل کو مبتدی کے ذہن کے قریب کردے جو بڑی بڑی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں"۔

منہجِ کتاب واسلوبِ بیان:

جن امور کی علّامہ شرنبلالیؒ نے رعایت کی ہے ان کا خلاصہ ۶/ چھ امور ہیں:

(۱) مبتدی طلبہ کی رعایت کرتے ہوئے مسائل کے الفاظ آسان استعمال کرنا۔

(۲) راجح قول جس کی صحت یقینی ہے اس کو ذکر کرکے ان کی نشاندہی ان الفاظ سے کرنا جو ترجیح وتصحیح پر دلالت کرتے ہیں البتہ صاحبِ تصحیح کو عموماً ذکر نہیں کرتے ہیں۔

(۳) وجہِ ترجیح کو نقل نہیں کرتے ہیں۔

(۴) عام طور پر اختلافات کو ذکر نہیں کرتے اور نہ غیر مرجوح قول کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۵) مسائل کے دلائل کو خاص مصلحت سے نظر انداز کیا ہے۔

(۶) اطناب اور طوالت سے گریز کرتے ہوئے حتی الامکان ایجاز واختصار کی رعایت کی ہے۔(مواهِب الفتّاح:۵۸)

نورالایضاح کی شرحیں اور حاشیے:

کتاب کی مقبولیت کی علامت ہوتی ہے کہ لوگ اس پر توجہ کریں، اپنی ہمتوں کی لگام کتاب کی خدمت کی طرف پھیریں، چنانچہ کوئی اس کی شرح کرے اور اس میں پوشیدہ خزانے کو ظاہر کرے، کوئی حاشیے لکھ کر اس کے معضلات ومشکلات کو حل کرے، کوئی نظم لکھ کر حفظ کرنے والوں کے لیے آسان کرے، کوئی اس میں ذکر کردہ احادیث کی تخریج کرکے اس کی اعتباریت میں چار چاند لگائے، غرض چہار جانب سے اس پر ٹوٹ پڑے۔

تقریبًا۱۵/ شروحات عربی میں لکھی گئی ہیں۔ بہت سی شروحات ادو زبان میں بھی ہیں، کئی عربی وفارسی حاشیے اور اردو ترجمہ سے بھی اس کتاب کی خدمت کی گئی ہے اور ۴/ منظومے لکھے گئے۔ بہ طورِ نمونہ مشتے از خروارے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) مصنف اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی کتاب کی خود شرح کرے کیوں کہ اس کو معلوم ہے کہ کہاں کس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مصنف علّام نے خود اس کی دو شرح کی: ایک مفصل جس کا نام انھوں نے ”إمدادا الفتاح شرح نور الإيضاح“ رکھا ہے۔ ”علّامہ شامی“ اس شرح کے بارے میں فرماتے ہیں: ”شرحٌ نفيسٌ فيه فوائدُ متفرقةٌ جليلةٌ“۔

(۲) دوسری مختصر شرح جو در حقیقت امداد الفتاح کا اختصار ہے جس کا نام رکھا ”مراقی الفلاح بإمداد الفتّاح شرح نور الإيضاح“ اسی شرح پر کئی حواشی بھی لکھے گئے، ان

ہی میں سے **ایک** ''طحطاوی علی مراقی الفلاح''**مشہور و معروف ہے۔**

(۳)''مسلم الفلاح الكاشف عن غموض مذنّب نور الإيضاح'' **از کماخی عثمان بن یعقوب۔**

(۴)''مصباح الفلاح شرح نور الإيضاح''**از امام مفتی حامد بن ابراہیم۔**

(۵)''معراج النجاح شرح نورالإيضاح''**از محمد علاء الدین بن محمد امین بن عمر بن العابدینؒ۔**

(۶) ''الإصباح على نور الإيضاح'' **حاشیہ از شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ۔**

(۷)''إيضاح الأصباح''**شرحِ اردو از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ۔**